سالنامہ (جنوری) ۱۹۶۰ء

نگار

سالانہ چندہ (علاوہ مصارف جنتری سالنامہ)

ہندوستان	پاکستان
۹ روپے ۵۰ نئے پیسے	دس روپے

قیمت فی کاپی

ہندوستان	پاکستان
تین روپے	

تصانیف نیاز فتحپوری

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذہب کی تحقیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی تاریخ پر تاریخی و علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشائیہ اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعۂ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے اس کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۴۶۲ صفحات کاغذ دبیز۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے چہ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ، ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے چہ (علاوہ محصول)

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے ہیں۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا اور ۲۸ پونڈ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپے (علاوہ محصول)

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، تخئیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا

سلکی پلین

جورجیٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون
نائیلن
نٹون

کپڑا

سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لِنن
شنٹون

کپڑا

اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پانامہ
پرشیا

ان کے علاوہ عمدہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگا۔

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹیڈ بی۔ ٹی روڈ امرتسر

ٹیلیفون:- 2562 تار کا پتہ۔ رین (Rayon.)

سٹاکسٹ = ٹراونکور رین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

ٹیکسٹائل مینوفیکچررز ایسوسی ایشن

4۔ کوئنز روڈ امرتسر

(پوسٹ بکس نمبر 79)

1۔ یہ ہندوستان کی تین منظور شدہ ایسوسی ایشنوں میں سے ایک ہے جنھیں بھارت سرکار کی طرف سے آرٹ سلک یارن کی درآمد کے لئے لائسنس دئے گئے ہیں۔

2۔ یہ شمالی ہندوستان میں ٹیکسٹائل مینوفیکچررز۔ اونی۔ آرٹ سلک۔ سوتی۔ شاڈی۔ وولن۔ کشیدہ کاری شدہ سامان۔ پرنٹنگ۔ ہوزری کا سامان اور فیتے و لیس تیار کرنے والوں کی سب سے بڑی ایسوسی ایشن ہے۔

3۔ 145 ٹیکسٹائل فیکٹریاں اس کی ممبر ہیں جن میں پندرہ ہزار کاریگروں کو روزگار ملتا ہے۔

مشینری

مشینری	تعداد	سالانہ پیداوار
پاور لومز :-	2000	تقریباً 1,18,00,000 گز
ہینڈ لومز :-	2000	تقریباً 16,00,000 گز
ایمبرائیڈری مشینیں :-	25	سامان مالیتی 50 لاکھ روپے
لیس۔ ٹیپ اور ربن مشینیں :-	80	سامان مالیتی 15 لاکھ روپے
سوتی کپڑا پرنٹنگ ملیں :-	20	تقریباً 25000 گانٹھ کپڑا
وولن سپنڈلز :-	13312	تقریباً 8,32,000 پونڈ
سکرین پرنٹنگ ٹیبلز :-	100	تقریباً 15,00,000 گز
ہوزری مشینیں :-	100	سامان مالیتی تقریباً 15,00,000 روپے

تیار ہونے والی قسمیں

آرٹ سلک :- نئون۔ شنئون۔ جارجیٹ۔ کریپ۔ ٹافٹہ۔ ہاٹ کریپ۔ ساٹن۔ ویلوٹ۔

سٹیپل فائبر :- شالیں۔ لِنن۔ بستر کی چادریں وغیرہ۔

ورسٹیڈ وولن :- گیبرڈین۔ پانامہ۔ سمر کلاتھ۔ مردانہ اور زنانہ سوٹنگ

شاڈی وولن :- کمبل۔ ملٹن کلاتھ۔

سوتی :- کوٹوں کا کپڑا۔ قمیضوں کا کپڑا۔ بستر کی چادریں۔ بکرم۔ کار ڈرائے۔ میز پوش۔ بیڈ کورز۔ آرائشی کپڑا۔

4۔ اس ایسوسی ایشن کا الحاق مندرجہ ذیل سے ہے:-

(ا) دی فیڈریشن آف انڈین چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری۔ فیڈریشن ہاؤس۔ نئی دہلی

(ب) فیڈریشن آف وولن مینوفیکچررز ان انڈیا۔ جے۔ کے بلڈنگ۔ ڈوگل روڈ۔ بیلارڈ اسٹیٹ۔ بمبئی

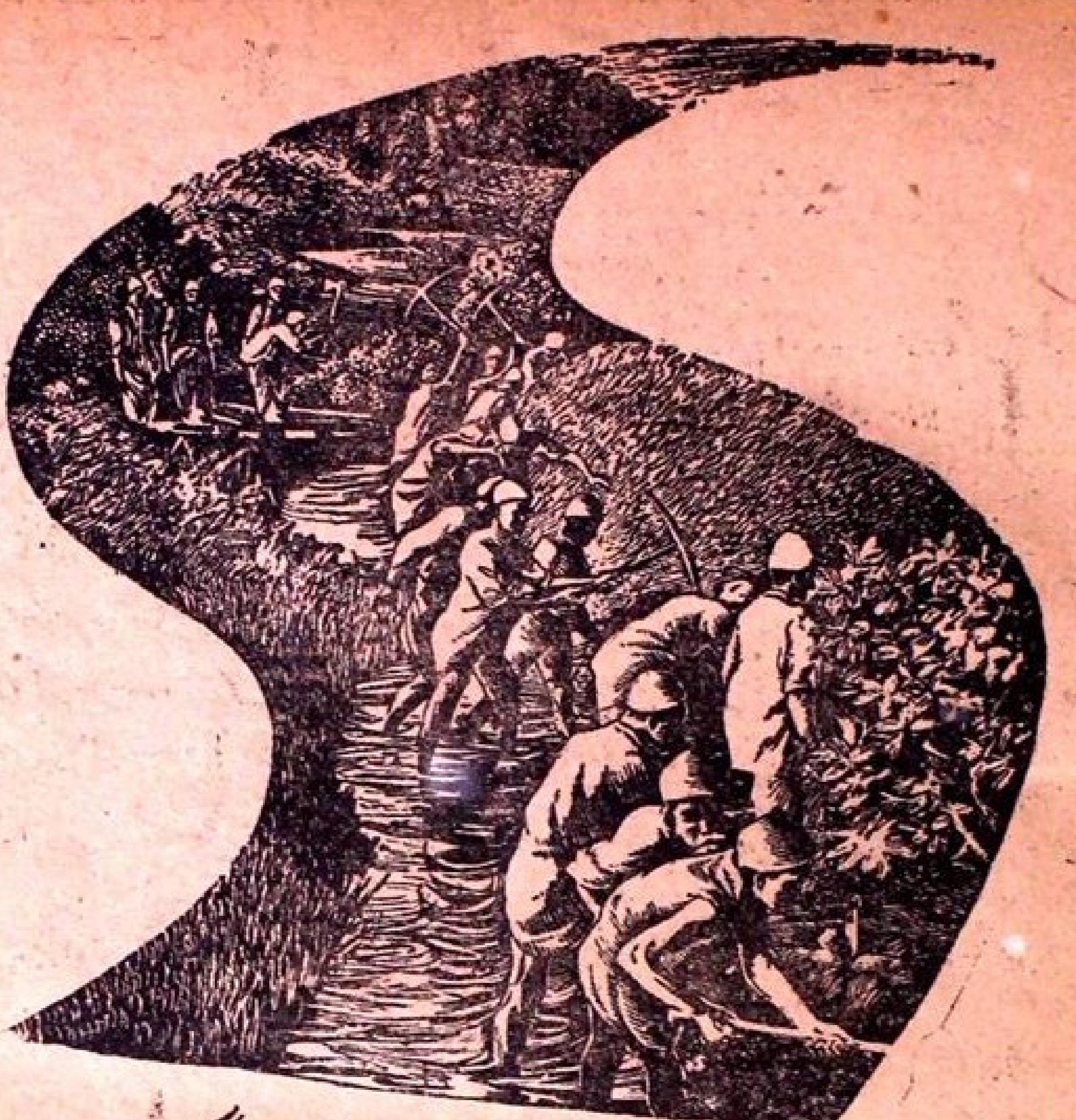

نہر میں پھر پانی بہنے لگا

رضا کارانہ کوششوں کا کرشمہ

جموں وکشمیر کے راہپال علاقے میں واقع کرناہ بلاک کی یہ ساڑھے سات میل لمبی نہر بہت دنوں سے بے کار پڑی تھی۔ لوگ اسے بھولے ہوئے سے تھے۔

ایک دن آیا۔ اس علاقے کے کوئی چار سو عوام اسے دوبارہ جاری کرنے کے کام پر جُٹ گئے۔ اُنھوں نے مٹی نکالی، کنارے اونچے اُٹھا کر مضبوط بنائے، پاٹ چوڑا کیا۔ پانی کے بہاؤ میں حارج پتھروں کو باہر نکال پھینکا۔ کوششیں پھل لائیں۔ پانی پھر سے بہنے لگا اب نواحی دیہات کا ایک بڑا رقبہ اِسی نہر سے سیراب ہوتا ہے۔

آپ کاج جگ کاج۔ رضا کارانہ کوششوں سے بڑی سہولتیں میسر آتی ہیں۔ اور ترقی کی رفتار بڑھتی ہے

پلان کی مدد اپنی مدد ہے
اپنی مدد آپ کیجیے

DA-29/233

بعض نوادر

مخطوطات و اسلحہ وغیرہ

کلام مجید کے دو ورق ۔ (۱) پوست آہو پر کوفی خط میں حضرت علی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ۔۔۔ (۲) قلمی مطلا، تین صدی قبل کا مخطوطہ ۔ سائز ۳ × ۲ انچ، کتابت کا بے مثل نمونہ (۳) خط نسخ کے نہایت قدیم خوشخط و مطلا نسخہ مع ترجمہ بزبان فارسی ۔ (۴) سات جلدوں میں، خطاطی کا بہترین شاہکار ۔ بین السطور میں دو ترجمے ایک فارسی کا دوسرا دکن زبان کا ۔ حاشیہ پر آیات کی شانِ نزول ۔۔۔ (۵) قدیم نسخہ، از اول تا آخر مطلا، نہایت خوش خط ۔۔۔ (۶) قدیم نسخہ، خطاطی کا بہترین نمونہ ۔

دلائل الخیرات ۔۔۔ قدامت اور خطاطی کے لحاظ سے بے مثل نسخہ ۔

مثنوی مولانا روم ۔۔۔ چھ دفتر دو جلدوں میں، از اول تا آخر مطلا ۔ (۱) بہترین ایرانی خط میں ۔ (۲) گیارہ صدی ہجری کا ایرانی مخطوطہ ۔

مثنوی شاہ و درویش ۔ ہلالی کی نایاب مطلا مثنوی، نقاشی و خطاطی کا بے مثل نمونہ مع دو قلمی تصاویر کے ۔

مثنوی مولانا نظامی گنجوی ۔۔۔ مولانا نظامی کی تین مثنویاں نہایت خوش خط و مطلا ۔

معراج نامہ منظوم ۔۔۔ یہ مطلا نسخہ اپنی خطاطی و جلد سازی کے لحاظ سے بڑی عجیب چیز ہے ۔

وصلیاں ۔۔۔ ایک بڑا ذخیرہ جن میں دو وصلیاں مشہور خطاط محمد حسین کشمیری کے ہاتھ کی ہیں، انکے حاشیہ پر بعض بیش بہا خوردبینی تصاویر ہیں ۔

دوسرے نوادر

(۱) چغہ نواب نصیر الدین شاہ اودھ ۔۔۔ (۲) چھڑی نواب محمد علی کرناٹک کی ۔۔۔ (۳) حقہ نواب ابراہیم علی خاں (ٹونک) باقرئی رنگ کے بلور کا ۔۔۔ (۴) گلدان والی ٹونک دخانی رنگ کے بلور کا ۔۔۔ (۵) کٹورا، نواب محمد علی (ٹونک) کا، بدری کے کام کا ۔۔۔ (۶) پستول، پیش قبض نواب محمد علی (کرناٹک) ۔۔۔ (۷) ڈسک صندل کی لکڑی کی ہاتھی دانت کی میناکاری، ہندو مذہب کی مورتیوں کی ۔۔۔ (۸) دو جیبی گھڑیاں جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے نواب کرناٹک کو تحفتاً دی تھیں ۔ ایک گھڑی اور جو پرنس آف ویلز کو تحفتاً دی گئی تھی ۔۔۔ (۹) کھرل سنگ سماق بہت بڑی ۔

فاروقی ۔۔۔ دفتر نگار لکھنؤ

ادارہ فروغ اردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور اسکے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں، آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت ہمیں بھیجدیجئے ۔ پندرہ دن کے اندر آپ کو ذریعہ رجسٹری ملجائیں گی (وی، پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جا سکتیں) آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہو، اور محصولڈاک بحساب ۵ فی صدی روانہ کیا جائے ۔

مینجر نگار لکھنؤ

سیاست الہیہ ... عہ	امراؤ جان ادا ۔ للعہ	جوڑ توڑ للعہ	سسرال ... عہ	اردو غزلگوئی .. عہ	مکاتیب نمبر مجلد عہ
ہماری داستانیں ۔ ۸ر	خدانخواستہ ... ۱۲ر	مضامین شوکت ۔ عہ	کارٹون ... ۱۲ر	عرب کے تین مدبر ۱۲ر	طنز و مزاح نمبر عہ
مضامین جمال الدین افغانی عہ	کنھیا ... ۱۲ر	غزالہ ... ۱۲ر	قاضی جی ... ۱۲ر	خالد بن ولید ۔ للعہ	بطرس نمبر ... عہ
انتقاد ... ۱۲ر	بقراط ... عہ	سودیشی ریل ۔ ۱۲ر	وغیرہ وغیرہ ... ۱۲ر	منٹو نمبر ۔ مجلد ۔ ۱۲ر	شخصیات نمبر مجلد عہ

"نگار" کا سالانہ چندہ

۱۔ مع مصارف رجسٹری سالنامہ دس روپیہ ہے۔
۲۔ اپنا نمبر خریداری جو ہر مہینہ پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے، اسے نوٹ کر لیجئے۔ مراسلت میں اس کا حوالہ ضروری ہے۔
۳۔ پاکستان کے خریدار ازراہ کرم دس روپیہ آٹھ آنے ذیل کے پتہ پر بذریعہ منی آرڈر بھیجکر رسید ڈاکخانہ یہاں بھیجدیں۔

عارف نیازی۔ ادارۂ ادب العالیہ
رضویہ کالونی۔ C/50۔ نزد ڈاک خانہ گولیمار نمبر۲۔ کراچی

۴۔ "نگار" کی مطبوعات اور خصوصی نمبر بھی آپ کو ادارۂ ادب العالیہ سے مل سکتی ہیں۔ یہ ادارہ اسوقت تک انتقادیات جذبات بھاشا۔ شاعر کا انجام۔ تبصرہ خلافت معاویہ و یزید شایع کر چکا ہے۔

مذاہب عالم

اپنی نوعیت کی بالکل پہلی اردو تصنیف۔

محمد عبداللہ المسعودی نے کامل تحقیق و تفتیش کے بعد بتایا ہے کہ اسوقت (۱) دنیا میں مختلف مذاہب کے متبعین کی کتنی حکومتیں کہاں کہاں پائی جاتی ہیں۔ (۲) انکی آبادی و رقبہ کیا ہے۔ (۳) انکا سیاسی، اقتصادی و معاشرتی موقف کیا ہے۔ (۴) انکی پٹرولی دولت کتنی ہے۔ (۵) انکے استعماری عروج و زوال کی تاریخ کیا ہے۔ (۶) دنیا کے جدید سیاسی معاہدات کی رو سے انکے باہمی تعلقات کیا ہیں۔ تین باب صرف مسلم حکومتوں کیلئے وقف ہیں جنمیں بتایا گیا ہے کہ اسوقت تمام دنیا میں انکی آبادی کتنی ہے کہاں کہاں انکی حکومتیں قایم ہیں اور سیاسی و اقتصادی حیثیت سے انکا کیا مرتبہ ہے۔ چھ سادہ و رنگین نقشوں اور متعدد ضمیموں کے ذریعہ سے ان سب کی جغرافی پوزیشن، تناسب آبادی، اقتصادی ذرایع اور سیاسی اہمیت کو نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب موجودہ عالمی حالات انکے بنیادی عوامل اور اسلامی حکومتوں کے موجودہ سیاسی موقف کو سمجھنے کیلئے حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ نہایت نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے اور مع محصول تیرہ روپے میں مل سکتی ہے قیمت پیشگی آنا چاہئے۔ وی پی نہیں بھیجا جائے گا۔ — مینیجر نگار لکھنؤ

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بہترین گلدستہ ہے آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں اُنکے متعلق سرخیاں قایم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سرخیاں قایم کی گئی ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ درج ہے۔ اساتذۂ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔ اردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات تقطیع بڑی

قیمت سات روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ **کتابستان — الہ آباد**

فروری سنہ ۶۰ء کا پرچہ علیحدہ شایع نہ ہوگا

(سالنامہ "نگار" سنہ ۱۹۶۰ء)

مکاتیب نیاز کا انتخاب

مرتبہ آنسہ عایشہ خان

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۷۷ | فہرست مضامین | شمارہ ۱-۲

ابتدائیہ — نیاز فتحپوری — ۱
نذرِ نیاز — عایشہ خاں — ۳
نیاز کی شخصیت — ۴
نیاز کے جاننے والے — ″
تعارف و تقرب — ″
طبعی خصوصیات — ۵
ذوق و اخلاق — ۷
میرے مطالعہ کی نوعیت — ۸
نیاز کے ابتدائی حالات — ۹
نیاز کے خطوط
(۱) بعض خواتین کے نام
تقریبِ ملاقات — ۲۳
لطفِ انتظار — ۲۴
تعزیت — ″
احساسِ نارسائی — ″
شکریہ — ۲۵
ماضی کی یاد — ″
حرفِ شکایت — ″
شکوۂ تلخ — ۲۶
حسرتِ ناکامی — ″
جلی کٹی — ۲۷
تلخیٔ رشک — ″
تہنیتِ شادی — ۳۰
راز و نیاز — ″
حرفِ تسلی — ۲۹
شکوۂ ناتمامی — ۳۰
یادِ ماضی — ۳۱
شکوۂ خامشی — ″
ایک مشورہ
مزاج پرسی — ۳۲

عنوان	صفحہ
ایک ملاقات کی یاد	۳۳
حرفِ تسلی	〃
گلۂ نارسا	۳۴
یادِ ماضی	〃
جذبۂ بیتاب	۳۵
عرضِ شکوہ	〃
شکریۂ دلپرسی	۳۶
آدابِ محبت	〃
شکریۂ عبادت	۳۷
عذر و تقاضہ	〃
عرضِ گرانجانی	۳۹
ادائے برہمی	〃
اعترافِ شوخی	〃
طنز و شوخی	〃
اعترافِ کمزوری	〃
فریبِ مسلسل	۴۰
(۲) شعر و ادب اور نقد و تبصرہ	
مشورۂ ترکِ غزل	۴۱
اصولِ فسانہ نگاری	〃
ترقی پسند شاعری	۴۲
کلامِ مومن	〃
داغ و امیر	۴۳
رموزِ نقاشی	۴۴
میرزا مظہر	۴۵
غالب و میرزا مظہر	۴۷
اُردو فارسی شاعری	۴۹
شعر کی جراحی	۵۲
شعر و پیغام	۵۳
سعدی کا تغزل	〃
شاعرانہ روح	۵۴
مومن کی شاعرانہ عظمت	۵۵
غالب کی شاعری	۵۶
جرأت	۵۷
شاعرانہ نکتہ وری	۵۸
کلامِ غالب	۶۰
شعرِ غالب	۶۱
اُردو انشاپردازی	۶۲
انشاء و جرأت	۶۳
غالب و میرزا مظہر	۶۵
نثر و شعر کا فرق	〃
عرفی و نظیری	۶۷
قدیم و جدید شاعری	۶۹
غالب و تصوف	۷۰
نسبتی	۷۱
فسانہ نگاری	۷۲
امیر اللہ تسلیم	۷۳
ذکرِ غالب	۷۴
شاعرانہ تعبیر	۷۵
غالب کا ایک شعر	۷۶
دادِ اشعار	۷۷
غالب کا بہترین شعر	〃
ہمارے مزاح نگار	۷۸
ذکرِ اقبال	۷۹
جلال اسیر	〃
بیدل	۸۰
ایہام اور غالب	〃
غالب و مومن	۸۱
جلال لکھنوی	۸۲
ایک شعر	۸۴
غالب	۸۵
نگاہ	۸۶
ذکرِ غالب	〃

تغزل ۸۸
ذکرِ بیدل ۸۹
شعرِ بیدل ۹۰

(۳) مذہب و اخلاق

طاعت و عبادت ۹۲
مذہب و رندی ״
خدا اور دین ۹۳
خدا و بت کا فرق ״
مولویوں کا طبقہ ۹۴
شیعہ سنی نزاع ״
حشر و نشر ۹۵
کفر و اسلام ״
اسلام اور تصویر کشی ۹۷
درسِ روحانیت و اخلاق ۹۹
گناہِ درویشی ״
کفر کا مفہوم ۱۰۰
ذکرِ حج ۱۰۱
تعویذ ״
عبادت و ریاضت ۱۰۲
بندگیِ محبت ״
خدا و ترکِ دنیا ۱۰۳
خدا کا صحیح تصور ״
شانِ رندی ۱۰۴
فلسفۂ ازدواج ״
علم و تعلیم نہاد دین ۱۰۵
گناہ و توبہ ״
حقیقتِ مذہب ۱۰۶
فلسفۂ حیات ״
اسلام و ذکرِ موت ۱۰۷
عورت اور پردہ ״
اسلام اور مذہب ۱۰۸
خدا کا تصور ۱۰۹
فردوس و جہنم ״
مذہب ریائی ״
مذہبی اختلاف ۱۱۱
وحی و الہام ۱۱۲
فلسفۂ عبادت ۱۱۳
مذہب و مولوی ״
مطالعۂ مذہب ״
مذہب کا صحیح تصور ۱۱۴
گناہ و معصیت ۱۱۵
مرتبۂ رندی ״
فلسفۂ معصیت ۱۱۶
مدارجِ ترقی ״

(۴) متفرقات

عذرِ سفر ۱۱۷
ایاز قدرِ خود بشناس ״
مشورۂ مصالحت ۱۱۸
فکرِ بیجا ״
بندگی و بندہ پروری ۱۱۹
متاعِ کم ارز ״
دعوائے عشق ״
نگاہ اپنی اپنی ״
احساسِ خودی ۱۲۰
درسِ زندگی ۱۲۱
احساسِ حقیقت ״
گرانمایگیِ بے سر و پائی ״
دوستانہ تنبیہ ۱۲۲
[illegible] ״
فکرِ مآل ״
طنز و اعتراف ۱۲۳
اب اور جب ۱۲۴

عایشہ ——— خاں

نیاز

سنہ ۱۹۲۵ء

سنہ ۱۹۳۰ء

اس میں شک نہیں، عورتوں میں عائشہ سے زیادہ قریب تر مطالعہ میری زندگی کا کسی نے نہیں کیا۔ انھوں نے مسلسل آٹھ سال تک مجھے دیکھا۔ خدا جانے کیا کیا باتیں انھوں نے مجھ سے اور میں نے ان سے کیں، کتنی بار وہ روٹھیں اور منیں۔ معلوم نہیں اپنی زندگی کے کتنے راز بطور خراج مجھے ان کو سونپنے پڑے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ مستحق مجھے ہدفِ ملامت بنانے کا اور کون ہوسکتا تھا، سو انھوں نے اس استحقاق سے پورا فایدہ اُٹھایا اور میں نے کہا کہ "چلو خیر" "بالائے غمہائے دگر" یہ بھی سہی"۔ پھر میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے جو کچھ میرے متعلق لکھا ہے وہ بالکل صحیح و درست ہے۔ انھوں نے بر بنائے محبت و عقیدت یقیناً اس میں مبالغہ سے کام لیا ہے (اور وہ کون سی عورت ہے جو مبالغہ سے کام نہیں لیتی) لیکن چونکہ

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

اس لئے ان کی تردید و مخالفت بڑے خطرہ کی بات ہے اور میں اس عمر میں کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں۔ عائشہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کی بیٹی ہیں اور میری بڑی محبوب شاگرد (گو وہ اب میری استاد ہوکر رہ گئی ہیں)۔ اس سے زیادہ تعارف کی ضرورت، نہ مجھ میں ہمت!

ان کی تعلیم اسی سرزمینِ جانِ عالم میں ہوئی، اور "شامِ اودھ" کے انھیں روشن دھندلکوں میں وہ پروان چڑھیں۔ یہیں سے انھوں نے معاشیات و عمرانیات میں ام۔ اے کیا اور اب وہ اوکلاہما (امریکہ) کی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کرنے گئی ہیں۔ وہیں سے انھوں نے اپنا تعارف نامہ اور انتخاب بھیجا ہے جس سے اس سالنامہ کا افتتاح ہوتا ہے۔

اللہ جمیلٌ و یحب الجمال

نیاز

نذرِ نیاز

"عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں"

(آنسہ) عایشہ خان
O.S.U
Still water
(Oklahama) U.S.A

نیاز صاحب کا خط (پہلی اکتوبر کا) بحیرۂ عرب اور بحرِ روم طے کرتا ہوا، جب ۱۰ راکتوبر کو مجھے ملا تو "Family relation" کے کلاس کا گھنٹہ بج چکا تھا اور مجھے تین چار منٹ کے اندر کلاس میں پہونچ جانا تھا — بھاگتے دوڑتے خط تو میں نے کھول لیا، مگر چند سطروں سے آگے کچھ نہ پڑھ سکی — لکچر شروع ہو چکا تھا۔

خط خلافِ معمول طویل معلوم ہوتا تھا یعنی پورے ایک صفحے کا، حالانکہ نیاز صاحب کے خط کچھ اس ڈھنگ کے ہوتے ہیں:-

"تم لکھنؤ آرہی ہو — بالکل جھوٹ !"

یہ میرے ایک طویل خط کا جواب تھا جو میں نے لاہور سے انھیں لکھا تھا۔

خط کی ابتدائی سطریں سات سمندر پار میرے لئے بڑی انمول محبّت و شفقت کا پیام تھیں — یوں تو ان کے خط بھی اہم ہوتے ہیں، مگر یہ خط تو ایک طرح سے میرے لئے مشعلِ راہ بھی تھا اور حکم بھی — لکھتے ہیں:-

"تم کہتی ہو تو چلو، انشا و لطیفہ نمبر ہی سہی، لیکن تعارف کون کرے گا؟ — نظارۂ ماہ کی دعوت دیتی ہو، تو کتاں کی چادر بھی تمھیں مہیا کرو — تم نے مجھے پڑھا ہے تو لکھو بھی — گو یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ لکھو وہ میری تعریف ہی ہو، میری برائی بھی کرو، اگر مجھ میں کوئی برائی ہے (حالانکہ نہیں ہے)"

یہ پڑھکر میں گھبرا اٹھی کیونکہ نیاز صاحب کے اس ارشاد کی تعمیل کے معنی یہ تھے کہ میں اپنی پچھلی آٹھ سال کی داستانِ زندگی چھیڑ دوں جس میں "Smooth Sailing" کے ساتھ طوفانوں کی بھی کمی نہ تھی اور اسی نسبت سے نیاز صاحب کی محبتوں اور شفقتوں کی بھی !

ہر تجربہ انسان کے لئے ایک نیا سبق ہے، مگر نیاز صاحب کی رہبری میں میرے تجربات کی نوعیت کچھ اور تھی اور

میرے سیکھنے کا انداز کچھ اور ۔

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما

اب میں کیا کہوں کہ نیاز صاحب میرے لئے کیا ہیں ۔ کتنے سچے دوست، کتنے شفیق استاد، اور کس قدر مجھ سے محبت کرنے والے! ــــــــ مجھے روتے ہوئے ان کے پاس ماں کا سا پیار ملا اور ہنستے ہوئے ہم عمری کا سا احساس گو آج تک میں نہیں سمجھ سکی کہ وہ اتنی محبت مجھ سے کیوں کرتے ہیں ۔ شاید اس لئے کہ بات بات میں "رو پڑنا" میری فطرت ہے اور وہ کسی عورت کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتے ۔

نیاز کی شخصیت

نیاز صاحب کی شخصیت کو سمجھنا مشکل ہے اور اس پر کچھ لکھنا اس سے زیادہ مشکل ۔ کیونکہ ان میں اتنی متعدد شخصیتیں جمع ہو گئی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا اور پھر علٰحدہ علٰحدہ ہر ایک کو سمجھنے کی کوشش کرنا کم از کم میری قوت سے تو باہر ہے! کسی اور کا حال مجھے معلوم نہیں ۔

ان کی سب سے نمایاں شخصیت ان کی علمی و ذہنی شخصیت ہے اور اسی کے ساتھ غیر معمولی عزم و استقلال جس کا سب سے بڑا ثبوت نگار ہے جو مسلسل ۴۰ سال سے ایک ہی رنگ میں ایسی پابندی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے کہ ان کی زندگی کا بڑے سے بڑا حادثہ بھی اس کی اشاعت پر اثر انداز نہیں ہو سکا ۔ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ المناک حادثہ ان کی اکلوتی جوان بیٹی کی موت تھی، لیکن میں نے خود دیکھا ہے کہ غم کا ایک طوفان ان کے سینہ میں جوش زن ہے اور آنکھوں سے سیلِ اشک جاری ۔ لیکن دست و قلم اور دل و دماغ بدستور اپنے کام میں مصروف ہیں ۔ حوادث کا ایسا شیرانہ و فلسفیانہ مقابلہ میرے تو تصور میں بھی کبھی نہ آ سکتا تھا ۔

وسعتِ معلومات

نیاز صاحب کی وسعتِ معلومات کا یہ عالم ہے کہ مذہب سے لیکر الحاد تک، ادب سے لیکر فلسفہ و حکمت تک ۔ قرآن سے لیکر موسیقی تک، کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر انھوں نے عالمانہ اظہارِ خیال نہ کیا ہو اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو کو جتنی معلومات انھوں نے بخشی ہیں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتیں ۔

نیاز کے جاننے والے

نیاز صاحب کے جاننے والوں کی کئی قسمیں ہیں ایک وہ جو صحیح معنے میں ان کو جانتے اور سمجھتے ہیں لیکن ایسے لوگ کم ہیں، دوسرے وہ جو ان سے محض رسمی واقفیت رکھتے ہیں، ایسے لوگ اور زیادہ کم ہیں، کیونکہ نیاز صاحب بہت کم آمیز انسان ہیں، تیسرے وہ جو ان کی شخصیت سے ناواقف ہیں مگر پھر بھی واقفیت کے مدعی ہیں اور ان میں سے اکثر غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ چوتھے وہ جو نیاز کے شیدائی ہیں ان کی انشا پردازی کے لحاظ سے، اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ پانچویں وہ جو انھیں ملحد و دہریہ سمجھ کر ان کے سایہ سے بھاگتے ہیں، لیکن ان کی تحریروں کو پڑھتے ضرور ہیں ۔

میں بدقسمتی سے اپنے کو ان میں سے کسی قسم میں شامل نہیں کر سکتی، لیکن مجھے یہ فخر ضرور حاصل ہے کہ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا، عرصہ تک دیکھا، خدا جانے کس کس رنگ میں دیکھا، گو آج تک میں نہ سمجھ سکی کہ سچ مچ کے نیاز کون اور کیسے ہیں ۔

تعارف و تقرب

تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے کہ نگار کا ایک خصوصی نمبر کتابوں کے بکس میں مجھے ملا، اور یہ سمجھ کر کہ ضرور کوئی خاص رسالہ ہوگا جو اتنی احتیاط سے رکھا گیا ہے، اٹھا لیا، الٹ پلٹ کر دیکھا، مگر سمجھ میں نہ آیا

اور وہیں رکھ دیا جہاں سے اُٹھایا تھا۔

اس کے بعد مختلف مواقع پر نگار کے ساتھ "علامہ نیاز فتحپوری" کا ذکر سننے میں آیا اور آپ ہی آپ یہ نقش ذہن میں جمتا گیا کہ یہ کوئی بڑے عمامہ اور چُغے والے بزرگ ہوں گے اس لئے ان کو دیکھنے کا خیال بھی کبھی پیدا نہ ہوا۔ اتفاقاً میں نے ایک دن ابا میاں سے پوچھا: "یہ نگار کہاں سے نکلتا ہے"۔ بولے:۔ "یہیں لکھنؤ سے"۔ میں نے پھر سوال کیا کہ:۔ "علامہ نیاز فتحپوری کہاں رہتے ہیں"۔ بولے:۔ "یہیں لکھنؤ میں رہتے ہیں"۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے علامہ ہمارے گھر سے قریب ہی چند فرلانگ کی دوری پر رہتے ہیں۔

نگار کوئی اُٹھا لے گیا یا شاید میں کہیں رکھ کر بھول گئی اور علامہ کو دیکھنے کا خیال بھی ختم ہو گیا۔

تقریباً تین سال گزر گئے۔ ۱۹۵۲ء کی ایک دوپہر ملازم نے آکر کوئی نام لیا۔ ابا میاں اُٹھ کر فوراً باہر چلے گئے، مجھے کچھ وہم سا ہوا کہ نام جانا پہچانا ہے۔ مگر بغیر مزید جستجو کے اپنی کتابوں میں اُلجھ گئی، کیونکہ امتحان کا زمانہ قریب تھا۔ ابا میاں نے مجھے بلا بھیجا اور میں دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر آ گئی۔ یہ تھا وہ موقع جب سب سے پہلے میری نگاہ نیاز صاحب پر پڑی اور معلوم نہیں کیوں مجھے یک لخت ایسا محسوس ہوا، جیسے میں غالب کے سامنے کھڑی ہوں — مجھے یاد نہیں کہ نیاز صاحب نے میرے سلام کا جواب دیا یا نہیں، کیونکہ میں دل ہی دل میں سامنے بیٹھے ہوئے بزرگ کی شکل کا غالب کی اس شبیہ سے مقابلہ کر رہی تھی جو عرصہ ہوا اسکول کی کسی درسی کتاب میں میری نظر سے گزری تھی۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد ابا میاں نے کہا کہ "امتحان کے بعد تم نیاز صاحب سے اُردو فارسی پڑھ لینا" تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی اور ابا میاں کو کوئی معقول جواب دینے کے بجائے بول پڑی:۔ "مگر یہ تو بالکل غالب کی طرح ہیں" —— اس بے سر پیر کی بات کا جواب ابا میاں دیتے تو کیا دیتے۔ خاموش ہو رہے۔

نیاز صاحب اس وقت پاکستانی پرمٹ کے سلسلہ میں کچھ مشورہ کرنے آئے تھے کیونکہ انھیں ایک مشاعرہ کی صدارت کے لئے کراچی جانا تھا۔ اس کے بعد وہ روز صبح ٹہلنے کے دوران میں گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے ہمارے یہاں ضرور آتے اور میں بھی ان کی اور ابا میاں کی گفتگو میں حصہ لیتی جس کا موضوع زیادہ تر سیاسی اور کمتر مذہبی و ادبی ہوتا تھا۔

اب میں روز صبح ان کا انتظار کرنے لگی اور رفتہ رفتہ ان سے ایسی مانوس ہو گئی جیسے وہ میرے ہم عمر ہوں۔ اور تنہا میں ہی نہیں، بلکہ گھر کے تمام افراد ان سے قریب تر ہو گئے اور ہر معاملہ میں ان کی رائے لی جانے لگی۔ وہ بچوں کے لئے گھریلو دواؤں کے نسخے بتاتے، ہومیوپیتھک دوائیں اپنے گھر سے لے آتے، کسی کو نوکر رکھنا ہوتا تو ان سے سفارش کی جاتی، جب کبھی تصویر کھنچنے کو جی چاہتا تو وہ اپنا کیمرا اور پلیٹیں لے آتے، کوئی چیز خریدنا ہوتی تو ان کی رائے لی جاتی، سینما جانا ہوتا تو ان سے درخواست کی جاتی، جہاں تک لکھائی پڑھائی کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ ان سے بہتر مشورہ کون دے سکتا تھا۔ نیاز صاحب ہی نے پہلے پہل مجھ میں لکھنے کا ذوق پیدا کیا، گو وہ پروان نہ چڑھ سکا۔

نیاز کے طبعی خصوصیات و معمولات

نیاز صاحب کی بڑی خوبی ان کی قوتِ برداشت ہے، وہ ہر بات دلچسپی سے سنتے ہیں بشرطیکہ حماقت کی نہ ہو۔ ان کے نزدیک انسان کا سب سے بڑا جرم احمق ہونا ہے۔ وہ اخلاق کے لحاظ سے محض انسانیت پرست ہیں اور مذہب کو بھی اسی معیار سے جانچتے ہیں۔

انسان کے لئے ان میں ایک لامحدود جذبۂ رفاقت و ہمدردی پایا جاتا ہے اور یہ خوبی ان میں نفسیات کے گہرے مطالعہ سے پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے انسانی فطرت کو ہر پہلو سے دیکھا ہے اور بہت ڈوب کر اس کا مطالعہ کیا ہے۔

وہ طبعاً بہت صفائی پسند ہیں گو کبھی کبھی ان کی نفاست پسندی میرے لئے تکلیف دہ بھی ثابت ہوئی۔ ایک بار سینما جانے کے لئے میں سفید شلوار و قمیص پر ہلکا سا دوپٹہ اوڑھ کر نکل آئی۔ وقت بہت کم تھا، لیکن جب تک مجھے واپس کرکے دوپٹہ نہ بدلوا لیا گھر سے باہر نہ نکلے۔ سینما پہونچے تو تماشہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ سینما کے شایق ہیں، لیکن زیادہ تر سائنٹفک فلم پسند کرتے ہیں، میں نے ایک بار پوچھا بھی کہ رومانی فلم آپ کیوں نہیں دیکھتے۔ تو بولے:۔ "رومان کیا جاتا ہے، دیکھا نہیں جاتا"۔

نفاست و سلیقہ ان کی فطری افتاد ہے، ان کی میز پر کتابوں، کاغذوں وغیرہ کا ایک انبار نظر آتا ہے، لیکن ایک خاص ترتیب کے ساتھ، ہر چیز اپنی جگہ باقاعدہ چنی ہوئی، قلموں کی جگہ الگ، پنسل و چاقو کی الگ، آلپین، پیڈ، جاذب، پیپر ویٹ، سب اپنی اپنی جگہ۔ جب تک میز کو وہ خود صاف نہ کر لیں، کام شروع نہیں کرتے۔ ان کے مکان کا فرش بھی Mosaic کا ہے جو روز صاف کیا جاتا ہے اور ممکن نہیں کہ کسی جگہ کوئی گندگی نظر آجائے، میں نے خود دیکھا ہے کہ بچے کاغذ پھاڑ کر صحن میں پھیلا گئے ہیں اور وہ ایک ایک کرکے انھیں چن رہے ہیں، اس لئے مجھے ان کے مکان میں مکھیاں کبھی نظر نہ آئیں، وہ سارے کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بات بات میں ملازم کو آواز نہیں دیتے۔ مکان میں جب کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ خود اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اس کی اصلی جگہ رکھ دیتے ہیں، ضرورت ہو تو وہ خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو بھی دیدیتے ہیں، فرنیچر بھی جھاڑن سے صاف کر لیتے ہیں، الغرض وہ کبھی بیکار نہیں بیٹھتے، اور یہی راز ہے انکی صحت و توانائی کا۔

اپنے اوقات کے وہ سخت پابند ہیں، صبح اٹھ کر ٹہلنے کے لئے نکل جانا، سات بجے تک، گھر لوٹ کر ناشتہ کرنا اور پھر ایک بجے تک لازماً میز پر بیٹھ کر کام کرنا، ڈیڑھ بجے کھانا کھانا، اس کے بعد دو گھنٹے قیلولہ کرنا، سہ پہر کو پھر کام میں لگ جانا شام کو کبھی کبھی سینما چلا جانا، رات کو ۸ بجے کھانا کھا کر دس گیارہ بجے تک مطالعۂ کتب میں مصروف ہونا، یہ ہے ان کا معمول زندگی جس میں کبھی فرق نہیں آتا۔

ان کا لباس سادہ مگر بہت صاف ستھرا ہوتا ہے، گرمیوں میں وہ صرف سفید تنزیب کا کرتہ پہنتے ہیں اور اسی لباس میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ جاڑوں میں البتہ گرم شیروانی اور کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتے ہیں۔ اور ٹوپی میں نے کبھی انکے سر پہ نہیں دیکھی۔ کھانے کا البتہ انھیں بہت شوق ہے لیکن دعوتوں میں جانا پسند نہیں کرتے، ان کے کھانے کے اوقات مقرر ہیں اور ممکن نہیں خلاف وقت وہ ایک لقمہ بھی کھا لیں۔ ہفتہ میں دو بار ان کے لئے پلاؤ ضرور پکایا جاتا ہے (بریانی سے انھیں نفرت ہے، اسے وہ ملغوبہ کہتے ہیں) اور قورمہ تو خالہ جان ایسا طیار کرتی ہیں کہ آج تک میں اس کا مزہ نہیں بھولی۔ مچھلی و مرغ خود جا کر خریدتے ہیں اور بڑے اہتمام سے پکواتے ہیں، پھلوں میں آم اور چیکو کے عاشق ہیں، سگریٹ اور حقہ سے انھیں نفرت ہے، اول تو ان کے جاننے والے ان کے سامنے سگریٹ سے احتراز کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی اجنبی ایسا آجاتا ہے جو ان کی طبیعت سے واقف نہیں تو بسا اوقات وہ اپنے کمرے میں اگر کی بتیاں سلگاتے ہیں تاکہ سگریٹ کی بدبو دور ہو جائے۔ پان البتہ کھاتے ہیں

لیکن خوشبودار زردہ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ چاء انھوں نے کبھی نہیں پی اور نہ چاء پینے والوں کو پسند کرتے ہیں، کافی، کوکو البتہ کبھی کبھی پی لیتے ہیں۔ گرمیوں میں برف البتہ ان کے لئے ضروری ہے۔

پہلے داڑھی رکھتے تھے، لیکن ۱۹۲۵ء میں اس کو بھی ختم کر دیا (مونچھیں رکھی تھیں) جب بھوپال میں اول اول انھوں نے داڑھی منڈائی تو سب سے پہلے مسجد گئے تا کہ سب کو بیک وقت اس کا علم ہو جائے، وہ ہر کام نہایت بے باکی سے کرتے ہیں، علی الاعلان کرتے ہیں اور توجیہ و تاویل پسند نہیں کرتے۔ اس کے بعد جب ۱۹۲۷ء میں وہ لکھنؤ آ گئے تو مونچھیں بھی صاف کرا دیں پہلے وہ خضاب بھی کرتے تھے، لیکن اب وہ بھی ترک ہو گیا۔

ذوق و اخلاق

ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت مغرور و متکبر انسان ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، اس میں شک نہیں وہ خود دار بہت ہیں اور کم کسی سے بے تکلف ہوتے ہیں، لیکن بے تکلف ہو جاتے ہیں تو یکسر باغ و بہار ہیں گفتگو بہت صاف و مدلل کرتے ہیں، جس میں ظرافت کا عنصر غالب ہوتا ہے اور Ready wit تو نیاز صاحب کا حصہ ہے ہر بات کا جواب نہایت برجستہ و برمحل دیتے ہیں۔ اور دوران گفتگو میں اشعار تو ایسے صرف کرتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے (یہی حال ان کی تحریروں کا ہے)۔

وہ بڑی غیر معمولی ذہانت کے مالک ہیں۔ جب وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو کوئی پہلو چھٹنے نہیں پاتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ریاضی کے اصول موضوعہ پر گفتگو کر رہے ہیں۔ منطقی استدلال میں وہ بڑے بڑوں کو خاموش کر دیتے ہیں اور اس کا سب سے نمایاں ثبوت ان کے وہ مذہبی مقالات ہیں جن کے جواب میں مذہبی علماء انھیں کافر و ملحد کہکر تو اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں لیکن ان کے دلایل کا جواب ان کے پاس کوئی نہیں ہوتا۔

ان کو سیر و شکار سے بھی خاص دلچسپی ہے اور بارہا Big games میں بھی حصہ لیا ہے۔ میں نے ایک دن پوچھا کہ آپ کا نشانہ کبھی خطا بھی کر جاتا ہوگا۔ بولے "اکثر، لیکن ہرنیوں کی حد تک بھی نہیں"۔ میں ہنس پڑی۔ ایسے چبھتے ہوئے فقرے ان کے میں روز سنا کرتی تھی۔

نقاشی سے انھیں خاص دلچسپی ہے اور جب کبھی میں ان کے سامنے کینوس لیکر بیٹھ جاتی یا اپنا کوئی نقش پیش کرتی تو وہ دیر تک اس فن کی نزاکتوں پر گفتگو کرتے۔ وہ Sur-realistic آرٹ کے سخت مخالف ہیں۔ ایک دن میں نے اس کا سبب پوچھا تو بولے کہ:- "بھئی یہ تصوّر ہی تصوّف ہے اور تصوّف کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا"

ان کو تصویر کشی کا بھی بڑا شوق ہے، چنانچہ ان کے پاس متعدد کیمرے ہیں منجملہ ان کے ایک Movie Camera بھی ۱۶ ملی میٹر کا ہے اور پروجکٹر بھی، جسے انھوں نے میرے تحفۂ شادی کے لئے رکھ چھوڑا ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ یہ تحفہ شاید مجھے اس شرط پر کبھی نہ مل سکے گا اور کسی دن مجھے زبردستی ان سے لینا پڑے گا۔ وہ سیر و سیاحت کے بھی بڑے شایق ہیں اور ہندوستان کا کوئی قابل ذکر مقام ایسا نہیں جہاں وہ نہ گئے ہوں لیکن سب سے زیادہ مداح انھیں کشمیر کا پایا اور سب سے متنفر بمبئی، کلکتہ و کراچی سے۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہاں انسان کے سوا سب کچھ ہے اور یہ سب کچھ Hedonism کے سوا کچھ نہیں"۔ وہ ہر چیز کو محض جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اسی معیار پر وہ ہر مادی و غیر مادی چیز کو تولتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ہر ذہنِ انسانی اسی بلندی تک پہونچ جائے، اور ان کی زندگی کی تمام تر یہی کوشش رہی ہے:-

Mostly people have a tendency to live by one or two Senses, but Niaz has a tremendous Capacity of being alert with his whole being.

نیازؔ صاحب (عورت کو چھوڑ کر) ہر معاملہ میں اعتدال کے قایل ہیں اور جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا کہ وقت کی پابندی ان کے لئے فریضہ سے کم نہیں، مگر بارہا ایسا ہوا کہ پھاٹک سے نکلتے نکلتے کسی پھول پر ان کی نگاہ پڑ گئی اور وہیں ٹھٹک کر رہ گئے اور اپنے خاص لہجہ میں سعدیؔ و حافظؔ، میرؔ و غالبؔ کے اشعار سنانے لگے۔

وہ تازہ ہوا اور کھلی ہوئی فضا کو بہت پسند کرتے ہیں اور قدرتی مناظر سے بیحد متاثر ہوتے ہیں، وہ کالے کالے بادلوں کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر چھپا ہوا "شاعر" سامنے آجاتا ہے۔

ان پر موسم کا اثر ویسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی نرم و نازک پودے پر۔ جاڑے اور برسات میں وہ بہت خوش رہتے ہیں اور گرمی میں حد درجہ بیزار و ناخوش، چنانچہ ان کی گرمی کی ڈانٹیں بارہا مجھ پر بھی پڑ چکی ہیں۔

کبھی کبھی میں نے نیازؔ صاحب کو بہت اُداس بھی دیکھا ہے، مگر وہ اپنی پریشانی کا اظہار کبھی دوسروں پر نہیں کرتے۔ میرے سامنے ان پر جو سب سے بڑا حادثہ گزرا، وہ ان کی جوان بیٹی کی موت کا تھا، لیکن جس طرح انھوں نے اسے برداشت کیا وہ صبر و ضبط کی ایسی عجیب و غریب مثال ہے کہ کوئی شخص اس کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتا۔

میرے مطالعہ کی نوعیت

میں نے نیازؔ صاحب کو سترّ کے لگ بھگ دیکھا لیکن میں نے مطالعہ کیا ان کا اس وقت سے جب وہ جوان تھے۔ اور میرا یہ مطالعہ محض قیاس نہیں بلکہ ان کے بہت سے ایامِ شباب کے واقعات پر مبنی ہے جو کبھی کبھی بے ساختہ ان کی زبان پر آگئے۔ لیکن میری یہ تمام معلومات ایک ایسی امانت ہیں جن کو میں کبھی ظاہر نہیں کر سکتی۔ تاہم مختصراً یہ کہنے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ وہ Byron کی طرح پیدا ہوئے اور اسی کی طرح زندگی بھی بسر کی۔

چنانچہ ان کا یہ فقرہ جو بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا تھا میں کبھی نہ بھولوں گی کہ:- "ہر حسین عورت میری معشوقہ ہے خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشہ میں ہو"۔ میں نے پوچھا اگر "حسین نہ ہو تو؟"۔ بولے:- "کوئی عورت غیر حسین نہیں ہوتی، عورت ہونا بجائے خود اک حُسن ہے"۔ میں نے کہا "کم از کم اخلاقی حیثیت سے تو ضرور اس کی اچھائی بُرائی کا فیصلہ کیا جائے گا"۔ فرمایا کہ:-

"عورت جتنی زیادہ غیر محتاط ہے، اتنی ہی زیادہ چاہے جانے کے لایق ہے"۔

اس وقت جبکہ میں لکھنے بیٹھی ہوں تو ان کی چاروں تصویریں اپنے سامنے رکھ لی ہیں جو انھوں نے مجھے کسی وقت دی تھیں اور اس طرح گویا ان کے شباب سے لیکر اس وقت تک کی پوری زندگی میرے سامنے ہے۔

یہ ۲۵ء - ۳۱ء - ۳۲ء اور ۵۶ء کی تصویریں ہیں لیکن ان میں فرق صرف عمر کا ہے، زندگی کا نہیں ـــ نیازؔ صاحب اب سے ۵۰ سال پہلے بھی جوان تھے، اب بھی جوان ہیں اور ہمیشہ جوان رہیں گے۔

ان کے گداز ہونٹوں سے ان کی جذباتیت، فراخ پیشانی سے ذہانت و بلند نظری (بودھ کی طرح) بڑے بڑے کانوں سے عزم و ثبات اور آنکھوں سے دلوں کا راز جان لینے والی مقناطیسیت اب بھی ظاہر ہوتی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کی یہ خصوصیات کبھی ان سے جدا نہ ہوں گی۔

نیاز صاحب بڑی بے چین طبیعت رکھتے ہیں اور ہر وقت کسی نہ کسی Excitement کی جستجو رہتی ہے یہاں تک کہ وہ ان کھیلوں میں بھی شریک ہوتے ہیں جو بچوں کے لئے مخصوص ہیں اور ہر ہفتہ گھوڑ دوڑ میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ betting کرتے ہیں لیکن قمار بازانہ حیثیت سے نہیں بلکہ محض Excitement کے لئے۔

نیاز صاحب کا حکم ہے کہ "تم میری بُرائی کرو اگر تم نے واقعی کوئی بُرائی مجھ میں پائی ہو"۔ ان کے اس فقرہ میں کتنا یقین پوشیدہ ہے۔ "گویا تم نے مجھ میں بُرائی کہاں پائی ہوگی"۔ مگر نیاز صاحب کو کیا معلوم کہ میں نے ان میں وہ بُرائی پائی ہے جس پر آج بھی اتنی دور بیٹھی ہوئی سر دھن رہی ہوں۔

سات آٹھ سال کی مسلسل معیت کے دوران میں نیاز صاحب نے اُردو، عربی، فارسی، ترکی، موسیقی، ہومیوپیتھی، فوٹوگرافی اور خدا جانے کیا کیا سکھانے کا ذمہ لیا، مگر ہوا یہ کہ مجھے کچھ نہ آیا، اور اس کا سبب صرف ان کی بیجا شفقت و محبت تھی۔ کاشکے وہ کسی سخت گیر استاد کی طرح وہ مجھے مارتے، سزا دیتے مگر جو کچھ شروع کرتے سکھا کر رہتے۔

ابتدائی حالات

نیاز صاحب کا نام ان کی والدہ نے نیاز محمد خاں رکھا تھا اور والد نے لیاقت علی خاں (تاریخی نام) جس سے بلحاظ اعداد ۱۳۰۲ھ نکلتا ہے۔ عیسوی حساب سے اس کا آغاز اکتوبر ۱۸۸۵ء سے ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نیاز صاحب کی عمر اس وقت ہجری سنہ کے حساب سے ۷۷ سال کے لگ بھگ ہے اور عیسوی سنہ سے کم و بیش ۷۵ سال۔ ان کی ولادت سنٹی گھاٹ میں ہوئی جو ضلع بارہ بنکی (اودھ) کا ایک گاؤں ہے، لیکن ان کا آبائی وطن فتحپور ہے اور اسی لئے وہ فتحپوری کہلاتے ہیں۔

نیاز صاحب کے والد صہبائی کے شاگرد تھے اور اپنے وقت کے بہت مشہور فارسی انشا پرداز تھے۔ انھیں سے نیاز نے سب سے پہلے فارسی کی تکمیل کی اور بہت کمسنی میں اس سے فارغ ہوگئے، چنانچہ یہ سُن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ ۱۸۹۲ء میں جبکہ ان کی عمر صرف سات سال کی تھی وہ سکندر نامہ پڑھتے تھے، اس کے بعد عربی کی تعلیم شروع ہوئی اور اس سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی کی۔ ان کی تعلیم فتحپور، لکھنؤ، رامپور میں ہوئی اور زیادہ تر اپنے والد کی نگرانی میں، عربی، فارسی اور انگریزی کے پرائیویٹ اساتذہ کے زیر اثر۔ ان کو خطاطی، شہسواری اور فنونِ سپہ گری کی بھی تعلیم دی گئی جو اُس عہد کے شریف و معزز خاندانوں کا دستور تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں تعلیم و تعلم کے تمام مراحل سے انھوں نے عملی زندگی شروع کی اور اس سلسلہ میں خدا جانے کہاں کہاں کی خاک انھیں چھاننا پڑی۔ اس زندگی میں انھوں نے کیا دیکھا، کن کن لوگوں سے ملے، دُنیا کے کیا کیا نشیب و فراز انھوں نے دیکھے۔ ان کی زندگی میں کیسے کیسے مد و جزر آئے، کس پامردی سے انھوں نے زمانہ کا مقابلہ کیا، ذہنی رجحانات میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں، اپنی فکر و رائے کی آزادی پر قایم رہنے کے لئے، کن کن دشوار گزار منزلوں سے گزرے، عائلی زندگی میں انھیں کن کن صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ایک بڑی طویل اور دلچسپ داستان ہے، جس کی تفصیل وہ خود ہی بیان کر سکتے ہیں۔ میرے پیشِ نظر اس وقت صرف ان کی ادبی زندگی ہے اور ادبی زندگی بھی وہ جس کا تعلق زیادہ تر جنسِ لطیف و انشاء لطیف سے ہے، جس کی ابتدا آج سے ۶۰ سال قبل یہیں لکھنؤ میں ہوئی (جیسا کہ خود ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے "میرے شباب کا سب سے پہلا چاند یہیں طلوع ہوا") اور اب تک ختم نہیں ہوئی، ان کی رومانی زندگی کا تعلق لکھنؤ، رامپور، بھوپال، دہلی، بانسی، کشمیر اور مسوری سے تعلق رکھتا ہے جن کا اشارہ خود ان کے خطوط میں بھی پایا جاتا ہے۔

نیازؔ صاحب نے پچھلی نصف صدی میں اُردو کی جتنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اس کا ذکر گویا ان کی پوری علمی و ادبی زندگی کا جایزہ لینا ہے اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔

نیازؔ صاحب کے علمی اکتسابات پر میرا اظہار خیال ”چھوٹا منھ بڑی بات“ سے بھی زیادہ چھوٹی بات ہے۔ فارسی، عربی تو میں نہیں سمجھ سکتی لیکن انگریزی میں تو بارہا مجھے ان کی وسعت معلومات کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ نہایت اچھی انگریزی لکھتے ہیں اور اصلاح تو ایسی کرتے ہیں کہ بایدو شاید۔ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی مہارت کا یہ حال ہے کہ ایک بار دہلی کے دوران قیام میں انھوں نے آسکر وائلڈ کی کتاب اُٹھا کر مجھ سے کہا کہ ”کاغذ قلم لاؤ“ اور اس طرح ترجمہ لکھانا شروع کیا گویا وہ کوئی اُردو کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے ترجمہ کا ذوق مجھ میں بھی پیدا کیا اور ایک حد تک میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل بھی کی۔

یوں تو علم و فن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر ان کے اجتہاد کی مہر ثبت نہ ہو، ان کے مخالفین نے بھی ان کے زورِ قلم کا اعتراف نہ کیا ہو۔ لیکن اس پر گفتگو کرنے کی میں اہل نہیں، علاوہ اس کے یوں بھی بہ لحاظ موضوع مجھے صرف ان کی ”انشاء عالیہ“ کو سامنے رکھنا ہے۔

نیازؔ صاحب کی ادبی زندگی یوں تو اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب ان کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی، لیکن ان کی شہرت کا آغاز سنہ [illegible] سے ہوا جب ان کے ادبی مضامین صلائے عام دہلی میں شایع ہونے لگے اور سیاسی مضامین و منظومات الہلال اور زمیندار میں۔ — اسی زمانہ میں ان کا سب سے پہلا طویل فسانہ ”ایک شاعر کا انجام“ کتابی صورت میں شایع ہوا اور یہ ان کی پہلی ابلی اختراع تھی جس نے اس وقت کے ادبی رجحانات کا رُخ پلٹ دیا۔ اس سے قبل ملک میں جو فسانے لکھے جاتے تھے، ان کا رنگ زیادہ تر تقلیدی تھا، لیکن نیازؔ صاحب کا ”شاعر کا انجام“ فسانوی دُنیا میں بالکل نئی چیز تھا، کیونکہ سب سے پہلے نیازؔ صاحب ہی نے ندرتِ بیان، جدتِ تشبیہات اور نسائی نفسیات کے تجزیہ سے کام لے کر یہ ثابت کیا کہ افسانہ کا حسن محض پلاٹ یا ٹکنک کا حسن نہیں بلکہ زبان و بیان کا بھی حسن ہے اور اس طرح سب سے پہلے نیازؔ ہی نے افسانہ اور شعر دونوں کو ملا کر ایک ایسی چیز دُنیا کے سامنے پیش کی جس کو دیکھ کر لوگ متحیر ہو گئے۔ اس کے بعد ان کا دوسرا فسانہ ”شہاب کی سرگزشت“ عرصہ تک رسالۂ تمدن دہلی میں مسلسل شایع ہوتا رہا۔ یہ افسانہ جسے ناولٹ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، اُردو کا سب سے پہلا فسانہ تھا جس نے نفسیاتی تجزیۂ کردار کو اُردو فسانہ نگاری میں رائج کیا اور اسی کے ساتھ اس انشاء عالیہ کو پیش کیا جس کی دوسری مثال ہمیں ادب اُردو میں نہیں ملتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کے تمام مشہور رسایل نیازؔ صاحب کی تحریریں حاصل کرنے کے لئے متمنی رہتے تھے اور ان کی ایک ایک سطر کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ — عہدِ شباب تھا نیازؔ کا بھی اور ان کی فسانہ نگاری کا بھی اور جب میں ان دونوں کو سامنے رکھ کر ان کے ادبی شاہکاروں کو دیکھتی ہوں (جو اس وقت تک کثرت سے شایع ہو چکے تھے) تو میرے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ نیازؔ کے عہدِ شباب کے وہ کیا احساسات تھے جنھوں نے ان کی تحریروں میں اتنی لطافت، نزاکت و بلند آہنگی پیدا کر دی۔

ان کی تمام تحریریں جو افسانوی یا رومانی ادب سے تعلق رکھتی ہیں صرف ایک ہی مرکزِ خیال سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ مرکز عورت ہے، عورت کے ساتھ مرد کی محبت ایک فطری و انبساطی ضرورت ہے اور کوئی نئی چیز نہیں، تمام دنیا کا کونسا شاعر ایسا ہے جس نے عورت کا ذکر نہ کیا ہو، کون سا فسانہ ایسا ہے جو عورت کے بیان سے خالی ہو۔ سبھی نے اس سے محبت کی لیکن نیازؔ نے

عورت کو چاہا نہیں بلکہ اس کی پرستش کی۔ اوروں نے اس سے عشق کیا صرف عورت سمجھ کر۔ نیازؔ نے اس کی پوجا کی اسے دیوی سمجھ کر اور اس باب میں انھوں نے اس قدر غلو سے کام لیا کہ لوگوں کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ سمجھنے کا موقع مل گیا کہ یہ سب کچھ ان کی جنسی ناآسودگی کا کرشمہ ہے۔ لیکن میں اس معاملہ میں دبی زبان سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی، کیونکہ میں ان کی زندگی کے بعض ایسے واقعات سے بھی واقف ہوں جنھیں انتہائی "جراتِ رندانہ" کہا جا سکتا ہے اور جن کا تعلق "جنسی ناآسودگی" سے تو نہیں مگر "ناکردہ گناہوں کی حسرت" سے ضرور ہو سکتا ہے۔ نیازؔ اپنی اس عمر میں بھی جوان ہیں اور غالباً ہمیشہ رہیں گے۔

ان کے سامنے عورت کا وہ تخیل نہیں جو عام طور پر کہا جاتا ہے، بلکہ وہ تصور ہے ایک ایسی Ideal. عورت کا جس کا وجود اس دنیا میں نہیں۔ خود انھوں نے اس کی تعمیر کی، اس کی پرستش کی اور پھر اس کو اپنے ہی لئے مخصوص بھی کر لیا، عورت کی تعمیر میں انھوں نے جس اہتمام سے کام لیا ہے اس کا علم ذیل کے فقروں سے ہو سکتا ہے:۔

اب سے بہت پہلے، کروڑوں برس پہلے، جب تکوین عالم کی بالکل ابتدا تھی، مذاقِ آفرینش یا تو پانی کی لہروں سے کھیلتا نظر آتا تھا، یا وادیٔ قاف کی نسرین و نسترن زاریں آسودہ! ——— خشکی کا حصہ سارے عالم میں صرف اسی قدر تھا، لیکن حالت یہ تھی کہ سبزہ نہ تھا مگر یاسمین اور چھوٹی سی چھوٹی موج آب نہ تھی مگر برگِ نیلوفر، سفید اور صرف سفید رنگ میں تمام کائنات ملفوف تھی، گویا نیچر ہنس رہا تھا ——— ایک شب کا واقعہ ہے، وادیٔ قاف میں سپید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفان عریانی بپا تھا، چاند چادر سیمیں پھیلا کر اس میں اتر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور چھوٹی چھوٹی موجیں چاندنی میں بسکر رہ گئی تھیں ——— چاند نصف فلک طے کر چکا تھا کہ سطح آب کی حرکت یکایک بند ہو گئی، نیلوفر کی کلیاں ساحل کی جانب ایک قطار میں آ کر قایم ہو گئیں، ہوا بند ہو گئی، اور ایک ایسا سکون پیدا ہو گیا، جیسے یہ مختصر سی دنیا چلتے چلتے اکبارگی کسی چیز کو دیکھ کر حیرت سے ٹھٹھک کر رہ گئی ہو ——— دفعتاً ساحل پر پھیلی ہوئی چاندنی بیٹھی اور نیلوفر کی ساری کلیاں دفعتاً کھل پڑیں بیشمار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں منھ میں ایک ایک صدف دبائے باہر نکل آئیں اور ہنس ایک ایک دانۂ مرجاں اپنی چونچ میں لئے ہوئے باہر آ گئے ——— ساحل پر ایک فرشتہ خاموش کھڑا ہے، وہ چاند کو دیکھتا ہے اور زمردیں قلم ایک ہاتھ میں اور ورقِ زرد دوسرے ہاتھ میں لے کر ساحل پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے، وہ کچھ متفکر تھا، کچھ سوچ رہا تھا اور اس ورقِ زر پر کچھ لکھنا چاہتا تھا، کہ دفعتاً وہ چونک پڑا اور اس نے وادی کی طرف منھ کر کے ہاتھ بڑھایا، خوشبو کی موجیں جو اٹھ رہی تھیں انھوں نے سمٹنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ سمٹتے سمٹتے یکجا ہو گئیں اور انھوں نے ایک سپید نورانی شفاف جسم اختیار کر لیا، فرشتے نے اس کو اپنی مٹھی میں لے کر ایسا فشار دیا کہ وہ بے شمار منور ذروں میں تبدیل ہو گیا ——— اس نے اب ان مچھلیوں کی طرف نگاہ ڈالی، اور یک اشارۂ انگشت جتنی سیپیاں تھیں سب کھل کر رہ گئیں، موتیوں کے شفاف و پاکیزہ دانے نظر آنے لگے اور اس نے ورق زر پر لکھ لیا پھر اک نگاہِ گرم سے ان موتیوں کی طرف دیکھا۔ اب وہ ایک سیال شے بن گئے، فرشتے نے یہ رقیق مادہ ان ذروں پر چھڑک دیا، لیکن اسی کے ساتھ وہ نیلوفر کی نرم و نازک پتیوں کو بھی دیکھتا جاتا تھا اور ان دانہائے مرجاں کو بھی جو ہنس لئے کھڑے تھے، رفتہ رفتہ وہ پنکھڑیاں سخت و سنگین ہو گئیں اور مرجان سپید۔ یعنی اس نے ان پتیوں کا لوچ لے لیا اور مرجاں کا رنگ اور اسی خاک میں انھیں بھی ملا دیا، ہنس چلے گئے مچھلیاں غائب ہو گئیں اور نیلوفر کی کلیاں سطح آب میں غرق،

اب اُدھر وادی قاف خالی پڑی تھی اور اِدھر ورقِ آب سادہ کامل ۱۵-۱۶ گھنٹوں کی لگاتار محنت کے بعد اس خاک میں خمیر پیدا ہوا تو فرشتہ نے اپنی اُنگلی کے اشارہ سے اپنے اور اس خمیر کے گرد ایک حصار کھینچ لیا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔

ایک دن، دو دن۔ ایک مہینہ دو مہینے، سال، دو سال، یہاں تک کہ برسوں ہوگئے اور وہ فرشتہ اسی پردۂ حصار میں غائب رہا۔ ایک شب وہی ساعت تھی، جب وہ نگاہوں سے غائب ہوا تھا، پورے پندرہ سال ہو چکے تھے، چاندنی وہی درخشانی اور پانی کی وہی روانی تھی کہ یکایک وہ سنگین حصار گھیل کر بہ گیا، فرشتہ خوشی سے اُچھل پڑا، اس نے عدن میں سنا تھا کہ جب پتھر پانی ہو جائے گا، اس وقت اُس کام کی تکمیل کا وقت آئے گا ـــــ ایک حسین و جمیل کالبد بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا، فرش خاک کا ہر ہر ذرہ، سطح آب کا ہر ہر قطرہ، چاند کے دریائے نور کی ہر ہر موج اس جسد بیجان کی طرف کھنچی چلی آتی تھی اور فرشتہ اپنے بازوؤں کی ہوا اور ہاتھ کی حرکت سے ہٹاتا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کا کام ایک حد تک پورا ہو چکا تھا، تاہم اس قطرۂ نور، رنگ اور لوچ سے بنائی ہوئی صورت میں ہنوز اک ایسی یکسانیت تھی، جس کو وہ دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ خاموش تھا، اور غور سے چاند کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً اُس نے فوراً چاندنی کی طرف ہاتھ کے ایک جھٹکے سے ایسا اشارہ کیا کہ وہ ہر جگہ سے مسک کر تار تار ہو گئی، تمام فضا میں باریک باریک، شعاعیں الگ الگ ہو کر رہ گئیں فرشتہ اس منظر سے بہت دیر تک متاثر رہا، اس کے بعد اس نے اپنی اُنگلیاں اُن شعاعوں کی طرف بڑھا کر آہستہ آہستہ مٹھی بند کرنا شروع کی، یہاں تک کہ جس وقت اُس کی ہتھیلی سے اُس کی اُنگلیاں مل گئیں، تو تمام عالم میں اندھیرا سا چھا گیا (روشنی اُس نے مٹھی میں کھینچ کر بند کر لی تھی) اور شعاعیں سیاہ چمکدار ریشم کے لچھوں میں تبدیل ہو گئی تھیں، فرشتہ نے فوراً وہ ساری چمک جو اُس کی مٹھی میں بند تھی، اس کالبد کی آنکھوں میں منتقل کر دی اور اُن ریشمی کرنوں کو خم دیکر شانہ و دوش پر چھوڑ دیا۔ ابھی اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ دفعتہً ایک آواز پیدا ہوئی آسمان پھٹ گیا۔ پانی خشک ہو گیا اور زمین بخار بنکر غائب۔ فرشتہ بیہوش تھا اور اس کالبد کے آگے ملائکہ سر جھکائے کھڑے تھے، حوریں ایک مودب حلقہ میں اُسے لئے تھیں اور "..ن کا ہر طائر ترانہ ہائے مسرت سنانے میں مصروف تھا ـــــ پھر اے عورت تجھے اپنی آفرینش کا حال نہیں معلوم مگر میں جانتا ہوں تیرے خمیر میں کتنی خوشبوئیں، کتنی رنگینیاں، کتنی نزاکتیں شامل ہیں، تجھے خبر نہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ تیرے تبسم میں کیوں ایک برگ گہر صدف کے کھلنے کا انداز پایا جاتا ہے، تجھے اُس وقت ہوش نہ تھا، مگر ہم دیکھ رہے تھے جب تیری انکھڑیوں میں سارے جہاں کی چمک منتقل کی جا رہی تھی، تو غافل تھی مگر ہم تیری ہی طرف کھنچے جا رہے تھے، جب تیری اس بلوریں گردن پر گیسو چھوڑے جا رہے تھے، تیری عصمت میں ایک صامئیت ہے، کیوں ہم اُس فرشتہ سے پوچھو جس نے کامل پندرہ سال تک بے آب و دانہ رہ کر تیری تعمیر کی تجھ میں حیا ہے، تو اپنے جسم کو سمیٹ کر ہم سے الگ ہو جانے پر مجبور ہو جاتی ہے، کیوں یہ اُس خلوت کا نتیجہ ہے جو برسوں ایک حصار رنگیں کے اندر تجھے لئے رہی ـــــ ہم کیوں تیری ایک اک شب کے لئے سارا مایۂ حیات دیدینے پر راضی ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ تو رات ہی کو پیدا ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ رات بے کیف و بے روح ہے جس میں تو نہ جگمگا رہی ہو!

آپ نے دیکھا نیازؔ کا تخیل عورت کے متعلق! میں سمجھتی ہوں کہ اس سے زیادہ "Etherial" (سماوی)، اس سے زیادہ "Artistical" (نقاشانہ)، اس سے زیادہ "Aesthetical" (جمالیاتی) اور Poetical

(شاعرانہ) اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر نیازؔ ادیب نہ ہوتے تو بہت بڑے نقاش ہوتے، حالانکہ ان کا ادب بجائے خود بڑی جمیل نقاشی ہے۔

۱۹۱۰ء سے لیکر ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ نیازؔ کے شباب کا تھا اور اس دوران میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر "عورت" ہی کی دنیا سے متعلق ہے اور اس موضوع پر انھوں نے اتنا کچھ لکھا کہ اگر جذبات کے لحاظ سے اس کی تقسیم کیجائے تو Subjective اور Objective دونوں حیثیتوں سے اس کی بہت سی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔

اس زمانہ کا سب سے زیادہ طویل فسانہ "کیوپڈ و سائکی" ہے جو انھوں نے دہلی کے دورانِ قیام میں لکھا اور جس کی اشاعت نے دُنیائے ادب میں ہلچل ڈالدی تھی، اس میں انھوں نے عورت اور اس کے جذبات کا تجزیہ جس ساحرانہ تکمیل کے ساتھ کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔

بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

(۱) "لیکن جب رات کو شاہی باغ کے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی، تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائکی باغ میں نقاب اُلٹ اُلٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔"

منظر نگاری ہو یا تجزیۂ جذبات بڑی نازک چیز ہے، ایک خاص تدریجی آہنگ چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں ایک انشاپرداز کا کمال یہ ہے کہ جب وہ Climax تک پہونچے تو صرف ایک فقرہ پر ختم کرکے دماغ میں سناٹا پیدا کردے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

(۲) "اُس نے چاندنی میں ایک جمائی لی اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی، وہ اب سونا چاہتی تھی، یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب ہی رہتی تھیں، اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں۔ ساری فضا سو رہی تھی آسمان و زمین سو رہے تھے، وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں چڑھ اُتر رہی تھیں، سو رہی تھی، مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش سائکی کو اپنے آغوش میں لئے سو رہا تھا—— آہ! اس حالت کو نیچر گھنٹوں تک دیکھتا رہا!"

(۳) "پھول اگر اپنی نکہت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو ہزار دفعہ دہی گا، جو ابھی گائی، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، مطربی اُتار دے، نغموں کو بھول جا، اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ، اور میرے ساتھ کراہ۔"

وینس، کیوپڈ کو سائکی کے پاس بھیجتی ہے تاکہ اس کے دل کو تیر سے زخمی کرکے اپنی محبت میں مبتلا کردے۔ اور وہ اپنا تیر و کمان لے کر چل دیتا ہے۔ لیکن جس وقت وہ سائکی کے باغ میں پہونچا تو:-

(۴) "سیاہ ریشمی چادر جو اس کی کمر سے لپٹی ہوئی سر تک پہونچ گئی تھی، ڈھلک گئی، سانے کھل گئے، سینہ گردن عریاں ہوگئے، سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر منتشر ہوگئے، ابروئیں تن گئیں، آنکھیں چڑھ گئیں، ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے کنجوں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سائکی پر خالی کردے گا، لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لئے، کیوپڈ نے سائکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا، کمان ہاتھ سے گر پڑی، چلہ اُتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا

آہ! کاش کوئی سائکی سے اس وقت جاکر کہہ دیتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی آرزو مند ہے، جس عشق کی اُسے تمنا

تھی وہ اب خود اس کا تمنائی ہے، صیاد خود اس کا مجروح ہے، عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اس کی نگاہ کا زخمی"۔

اس پر نیاز کا خطاب کیوپڈ سے ملاحظہ ہو:۔

(۵) "جا، تیرا تیر، اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا، تیری کمان صرف اک خمیازہ ہے بے مزہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کانشانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آج سائکی کے باغ میں بے ہوش پڑا ہے"۔

کیوپڈ جب ناکام جاتا ہے تو اپنی ماں وینس سے ان الفاظ میں معذرت کرتا ہے:۔

(۶) "اے وینس مجھے ملامت نہ کر، کیونکہ سائکی تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پر افسوس بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے"۔

نمبر ۴ - ۵ - ۶ کے آخری فقروں کو پڑھئے اور ان کے زور دار Climax کو ملاحظہ کیجئے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز دماغ میں گونج کر رہ گئی ہے اور سر پکڑ کر بیٹھ جانے کو جی چاہتا ہے۔

عورت کے متعلق نیاز کے جذبات کی بلندی ہمیں اس وقت انتہائی عروج پر پہونچ جاتی ہے جب وہ اخلاقی تصورات کو بھی اس میں شامل کر دیتے ہیں، لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ جب وہ حُسن و اخلاق دونوں کو ایک ساتھ ملا دیتے ہیں تو پھر ان کی نقاشی ایک فلسفہ ہو کر رہ جاتی ہے، اور عورت کی عظمت کا تصور بالکل نئے زاویئے سے ہمارے سامنے آتا ہے۔

نیاز کو بلند شاعرانہ تعبیرات اور جذبات کے Visualize کرنے میں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اس کی ایک بڑی پاکیزہ مثال ہم کو اس مضمون میں ملتی ہے جو ایک رقاصہ کو دیکھ کر انھوں نے لکھا ہے:۔

جب تو اپنے سانچے میں ڈھلی ہوئی کشیدہ قامتی اور اپنی قدِ آدم رعنائی کو لے کر محفل میں کھڑی ہو جاتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس فتنۂ سرکش، اس سحرِ خوش قامت، اس قامتِ بلند بالا کو نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں اور کانپتا ہوں، جب تو اپنی آواز میں نرمی و بیچارگی، پیدا کر کے اپنے نغمہ کو میرے دل کی سب سے پنہاں رگ میں ڈبوتی جاتی ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ اس صدائے بے پناہ کی طرف سے اپنے کان بند کر لوں، لیکن ایسا نہیں کر سکتا، سنتا ہوں اور مٹتا ہوں ——

جب تو گردن میں ذرا خم دے کر ایک خاص ادائے حجاب سے اپنے چہرے پر صرف آدھا گھونگھٹ کر لیتی ہے، اس حال میں کہ گھونگھٹ کے کنارے کو تیرے نازک ہاتھ کی صرف دو حنائی انگلیاں تھامے رکھتی ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ اس پردۂ عریاں سے اپنی جان بچا کر کہیں نکل جاؤں۔ لیکن نہیں نکل سکتا دیکھتا ہوں اور تباہ ہوتا ہوں، جب تو اپنی نازک کمر میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر کے فرش پر تیرتی ہوئی سی چلتی معلوم ہوتی ہے، تو میں کوشش کرتا ہوں کہ تجھے نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں اور تیرے جسم کی ہر جنبش پر مٹتا جاتا ہوں —— جس وقت تو اپنا زیر نقاب چہرہ ایک طرف موڑ کر، اپنے ایک ہاتھ کو بل و خم دیتی ہوئی چھوٹی انگلی کے ارتعاش سے اپنی کمر کی لرزش کو چھوتی ہے اور دوسرے ہاتھ کو پلٹ کر سر پر رکھ لیتی ہے تو میں تیری طرف سے اپنی نگاہیں پھیر لینا چاہتا ہوں، لیکن نہیں پھیر سکتا —— جس وقت تو سرو قد کھڑی ہو کر، اپنی نازک لانبی، پتلی انگلیوں کو باہر کی طرف خم دے کر صرف ہتھیلیوں کے تصادم سے تالیاں بجاتی ہے اور متواتر لرزش، کے ساتھ ساز کی طرف ایک اُٹھتی ہوئی نگاہ ڈال کر اپنا رقصِ نغمہ ریز شروع کرتی ہے، تو میں اپنی نگاہیں نیچی کر لینا چاہتا ہوں مگر نہیں کر سکتا، دیکھتا ہوں اور تڑپتا ہوں —— جس وقت تو اپنے حنائی پاؤں میں سے ایک پاؤں کو زمین

پر قایم رکھ کر اور دوسرے پاؤں کی ایڑی اُٹھا کر، صرف پنجہ کی ہلکی ہلکی ٹھوکر سے گھونگروؤں کی آواز کو ساز کے تال و سم کے ساتھ ملا کر ہوا میں منتشر کر دیتی ہے، تو میں اس منظر سے جان بچا کر کسی طرف نکل جانا چاہتا ہوں مگر نہیں نکل سکتا۔ پھر ——
اگر میں تیرے رقص سے جس کو میں خرامِ نغمہ یا نغمۂ خراماں کہہ سکتا ہوں، کانپتا ہوں، ڈرتا ہوں، تو مجھے معذور جان کہ واقعی میں اس کی تاب نہیں لا سکتا —— تو تو صرف گا، مگر رقص نہ کر، ہر چند تیرا نغمہ بھی ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے، لیکن جب تو آمادۂ رقص ہوتی ہے اور ساز کے تال سم کے ساتھ تیری بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی ہے تو بے اختیار یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ میں بھی تیرے ساتھ رقص کرنے لگوں —— جب تو اپنے چرائے ہوئے بدن، کھنچی ہوئی گردن، بل کھاتی ہوئی کمر کے ساتھ رقص کرتی ہے، اُس وقت وہ ساری شرارتیں اور جسارتیں مجھ میں عود کر آتی ہیں جن سے میرے شباب کی ترکیب ہوئی ہے اور تیری نزاکت کی طرف سے اپنے اندر ایک سخت خیال دشمنی پاتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تیرے بازو کے ہر بل، تیری کلائی کی ہر جنبش، تیری کلائی کی ہر لچک اور تیرے جسم کا تمام توڑ مروڑ صرف اپنے لئے مخصوص کر لوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ تو ہر ایک کو ایسا کرنے کی اجازت دے سکتی ہے اور یہی مجھے پسند نہیں —— اپنی آنکھوں کی وہ شراب جو ابھی تیری لانبی پلکوں سے ٹپک رہی ہے —— یہ تیرے خونِ صبیح کی پھوٹ نکلنے والی سُرخی، وہ تیرے گورے گالوں میں بھرا ہوا رنگِ شباب جس کو میں بلور شعلہ رنگ یا شعلۂ بلوریں کہہ سکتا ہوں اور پھر وہ تیرے سینہ پر دہرائے ہوئے آنچل کے پلو کا چہرہ تک پہونچ جانا اور وہاں اس کی زریں باریک جھالر کا دمکتے ہوئے چہرہ پر برقی روشنی میں جھل مل ہونا اس میں ایک روشن تھرتھری پیدا ہونا، آہ کیا قیامت ہے کہ تو ان چیزوں کے سامنے مجھ سے میرے ایمان، میرے صبر و تقویٰ، میری متانت و سنجیدگی کی قیمت پوچھتی ہے، تجھے کیا خبر کہ اس وقت میں انھیں کس قدر ارزاں دے دینے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہوں —— دیکھ تیری دو حیثیتیں ہیں ایک صرف عورت ہونے کی اور دوسری رقاصہ و مغنیہ ہونے کی اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھ، تو صرف اس لئے نغمہ و رقص کو اختیار نہ کر کہ تو عورت ہے، تو صرف اس لحاظ سے اس فن کی نمایش نہ کر کہ تیری نسائیت میں اس سے زیادہ دلکشی و دلربائی پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ تو گا، محض گانے کے لئے رقص کر صرف رقص کی غرض سے۔ جس وقت تو حالتِ رقص میں ہوتی ہے تو میں یہ آرزو اپنے دل میں پاتا ہوں، کہ کاش تو اس وقت اسی حیثیت سے میری آغوش میں آسکتی اور شاید تو آجائے، اگر میں بلانا چاہوں مگر مجھے یہ پسند نہیں آ کہ تو اس حیثیت سے اس قدر آسانی سے مل جائے ——

تو خواہ کتنی ہی عصمت فروش ہو، لیکن اپنے فن کی معصومیت کو مجروح نہ کر، تو اس کے ذریعہ سے اپنے بازارِ حُسن کو رونق نہ دے تو خوبصورت ہے، تیرے اعضا میں تناسب ہے جسم میں کشیدگی ہے۔ آنکھوں میں سحر ہے۔ چتون میں افسوں ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ ابھی تیری نئی جوانی ہے انھیں سے کسی کو پناہ نہیں مل سکتی —— وہ تیرا لحنِ گلوسوز، وہ ساز میں ڈوبی ہوئی آواز، ایسی ڈوبی ہوئی کہ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ تیری آواز، صدائے ساز ہے یا صدائے ساز تیری آواز، ہنگامِ رقص وہ تیری شوخ و متحرک چتونیں جن کے نظامِ حرکت سے اصولِ ریاضی منضبط ہو سکتے ہیں، وہ پھڑکنے والی ابروئیں جن کی نازک لرزش پر ایک مصور کا قلم رشک کر سکتا ہے، وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عمق ڈوب سکتا ہے، وہ نگاہیں جن کے بسط میں فضا کی وسعت گم ہو سکتی ہے، وہ کمر کا لوچ جو دُنیا کو رعشہ بر اندام کر سکتا ہے، وہ گردن کی جنبش جو دُنیا کی نیندوں میں تھرتھری

وہ پیدا کرسکتی ہے وہ نصف سر پر ترچھا آنچل رکھ کر ایک خاص انداز سے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی نوک ٹھوڑی پر رکھ کر کھڑا ہوجانا جو ساری دُنیا میں تیری حکومت کرا سکتا ہے ——— اگر کہیں تو یہ سمجھ جائے کہ دُنیا میں تو صرف اس لئے آئی ہے کہ دلوں میں جذبات پیدا کرے اور الگ ہوجائے۔ دلوں میں حوصلے، سینوں میں اُمنگیں پیدا کرے اور ہٹ جائے، دماغوں میں جستجوئیں، ہستیوں میں بے تابیاں پھیلائے اور علٰحدہ ہوجائے تو خدا جانے تو کیا ہوجائے ——— تیرے لئے تسکین خواہشات فرض نہیں، میں تیری قدر صرف اس وقت تک کرسکتا ہوں جب تک تو میرے لئے صرف ایک خلش ہے، لیکن یہ جاننے کے بعد کہ تجھ سے خلش دور بھی ہوسکتی ہے، میں اپنے اندر اضمحلال پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اب میں دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا ——— الغرض تو جو چاہے کر، جو چاہے بن، مگر وہ آزاد و رمیدہ آغوش سے دور، معانقہ سے الگ، اور پھر مجھ سے پوچھ کہ تو کیا ہے؟

نیاز کے عہدِ رنگیں کے بعض واقعات جو میرے علم میں ہیں، ان کی تفصیل غالباً مناسب نہ ہو۔ لیکن ایک خاص واقعہ جس کا ذکر خود انھوں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، اس کا حوالہ شاید نامناسب نہ ہو۔

ان کے شباب کے دو مہینے جو انھوں نے نمائش الہ آباد (سنہ ۱۹۱۰ء) میں صرف کئے ایک مستقل رومان تھے۔ انھیں میں سے ایک خاص واقعہ کا ذکر اُن کی زبان سے سنئے:۔

"میں دوکان کے سامنے بیٹھا ہوں کہ ناگہاں ایک تلاطم نور، ایک سیلاب رنگ، ایک طوفان حسن و شباب یعنی ایک "پارسی دوشیزہ" دوکان کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے اور ایک ایسے غرور و پندار کے ساتھ گویا وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے، دیوار پر ٹنگی ہوئی ساریوں کو آکر دیکھنے لگتی ہے، جب تک میں آگے بڑھوں وہ تیتری کی طرح اِدھر اُدھر کا چکر لگاکر، ایک آسمانی رنگ کی بنارسی پر اپنا ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھتی ہے، یعنی قیمت دریافت کرتی ہے، میں آگے بڑھ کر گویا یہ دیکھنے کے لئے کہ قیمت کیا ہے، ساری کا کونہ ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں لیکن بالکل بے اختیارانہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ پڑجاتا ہے، وہ چونک پڑتی ہے، میں معذرت کرتا ہوں کہ "معاف فرمائیے میں نے تو آپ کے ہاتھ کو بھی ساری ہی کا زرکار بوٹہ سمجھا تھا"۔

نیاز ایک خانہ بدوش قافلہ کی لڑکی کو دیکھتے ہیں اور اس کے وحشیانہ لیکن فطری حُسن کو دیکھ کر جذبات کا ایک ناقابل ضبط ہیجان ان کے اندر پیدا ہوتا ہے اور وہ اس قافلہ کے ساتھ رہ پڑنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں بڑے والہانہ انداز سے کیا ہے۔ اخیر کے چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

"تو اے فرزندانِ صحرا، کیا تم مجھے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دوگے، کیا مجھے اس شیام رنگ لڑکی سے جو اپنی خوبصورت آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے، دو باتیں کرنے کی اجازت دوگے ——— لیکن اگر تم اس پر راضی نہیں تو اس سے کہدو کہ مجھے نہ دیکھے اپنی جادو کرنے والی نگاہیں میری طرف سے ہٹالے۔ میرے پاؤں تھرتھرا رہے ہیں، میرا بدن کانپ رہا ہے، میں اس کی طرف کھنچا جارہا ہوں، اور وہ مجھے کھینچ لے گی"۔

نیاز کا قیام آج گڑھ میں ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء کی بات ہے۔ یہاں بھی دُنیائے رنگ و بو اور فضائے حُسن و محبت میں جس طرح انھوں نے زندگی بسر کی اس کا اندازہ ان کے ایک خط سے ہوسکتا ہے جو اس زمانہ میں اپنے ایک دوست کو لکھا تھا:۔

"ایک بات اور ہے ـــــ ان میں کہنے کی تھی مگر خیر سن لو۔ حزیں کو بنارس میں ہر "برہمن بچہ" لچھمن و رام نظر آتا تھا لیکن یہاں ہر ہر قدم پر "سیتا و رادھا" کا سامنا ہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ

بے پردگی دیوانۂ طرحِ نقاب افگندنش

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں۔ بلند بالا۔ صحیح و توانا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی۔ گردنیں تنی ہوئی۔ آنکھوں میں تیر۔ مانگوں میں عبیر۔ ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر۔ ہاتھوں میں مہندی۔ ماتھے پر بیندی ـــ کیا پوچھتے ہو کیا عالم ہے"

یہاں کی رومان آفرین فضا پر نیاز کے ایک اور خط سے خاص روشنی پڑتی ہے جو اجے گڑھ چھوڑنے کے بعد انھوں نے کسی کو لکھا تھا

جانِ نیاز! ـــــ قاصد پہونچا اور دفعتاً آپ کا باندہ چلا آنا معلوم ہوا ـــــ اتنی بڑی قربانی، اور میرے لئے اللہ، اللہ

دلے دارم خراب از التفاتِ چشم بیمارت

ہمہ از جور می ترسند ومن از لطف بسیارت

میری مجبوریاں آپ سے مخفی نہیں۔ اس لئے اب آپ ہی بتایئے کہ کیا کرسکتا ہوں، یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آکر آپ پر سے قربان ہو جاؤں لیکن اجے گڑھ واپس جانا مناسب نہیں، اگر آپ کا وہاں سے چلا آنا بغیر اجازت کے ہوا ہے تو بھی واپسی میں حرج نہیں، زیادہ سے زیادہ دو چار اشکِ ندامت کافی ہوں گے اور اجازت حاصل کرلی گئی ہے تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں، اول تو مجھے یقین نہیں کہ وہ آپ سے اس قدر خفا ہیں اور اگر ہوں بھی تو راضی کرلینا آپ کے لئے چنداں مشکل نہیں، بپھر کر، بگڑ کر نہ سہی، آنسو بہا کر سہی۔

یہیں کے ایک اور واقعہ کا ذکر ایک دوسرے خط میں اس طرح کرتے ہیں:۔

ظالم! ـ اب کیا پوچھتے ہو کہ یہ سب کیونکر ہوا ـــــ شام کا وقت ہے ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی ہے، محل کے پائیں باغ میں روشوں پر ٹہل رہا ہوں، طلبی کا انتظار ہے ـــــ دفعتاً سامنے ایک مجسمۂ حسن و رعنائی نظر آتا ہے ـــــ ٹھیک اسی وقت چوبدار آتا ہے اور میں اندر چلا جاتا ہوں، لیکن یہ دو چیزیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں، ہلکے سانولے رنگ میں شفق کا انعکاس اور طاؤس کی سی مستی رفتار،

اے جمالِ تو بتاراج نظرہا گستاخ   اے خرامِ تو بہ پامالی سرہا گستاخ

بسنت کی صبح ہے، دربار میں رسم گلبازی کی طیاریاں ہو رہی ہیں گلاب اور گیندے کے سرخ و زرد پھولوں سے آنچل معمور ہیں، مہاراج برآمد ہوتے ہیں اور بہار کی راگنی کے ساتھ ہی یہ رسم شروع ہو جاتی ہے، تم کبھی آؤگے تو دکھاؤنگا کہ اس پھول کی پنکھڑی اب تک میرے پاس محفوظ ہے جو میرے سینہ پر پڑا اور ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گیا۔

بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ مسوری کا بھی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

سنیئے، ٹھیک دوپہر کو راج پورہ سے ٹیلیفون آتا ہے۔ میں یہاں پہونچ گئی ہوں۔ لنچ کے بعد چلوں گی۔ یہ وہ خبر تھی جس کے سننے کا دل ازل سے منتظر تھا ـ ۴ بجے کا وقت ہے گہرا ابر محیط ہے۔ پہاڑ کی خنک ہوائیں جسم میں سردی لیکن دل و دماغ میں شراب کی سی گرمی پیدا کر رہی ہیں کہ دفعتاً بنگلہ سے باہر (مڈاسٹریم، میں میرا قیام تھا) چہل پہل سی معلوم ہوتی ہے

اور میں باہر نکلتا ہوں ـــــ معلوم نہیں غالبؔ کا "نگار آتشیں رخ سر کھلا" کیا تھا لیکن یہاں تو وہ ایک سمٹی ہوئی روشنی تھی پیکرِ انسانی میں، ایک قید کی ہوئی بجلی تھی عالمِ آب و گل میں۔ آنکھیں یکسر سحرِ بابل، لب "ہمہ خونِ صد میخانہ" اور اب یہ نہ پوچھئے کہ حسن کیا تھا بس یوں سمجھئے کہ جوانی کانٹے پر تُل رہی تھی، پھر غور کیجئے کہ جس شخص کو ایک دن نہیں مسلسل چار مہینے اس شعلۂ جوالہ، اس برقِ بے پناہ کی معیت حاصل ہو رہی ہو وہ زندہ کیونکر رہ سکا۔

نیازؔ نے عورت کو خدا جانے کس کس حال میں دیکھا، کن کن زاویوں سے اس کا مطالعہ کیا اور کیا کیا جذبات ان کے دل میں پیدا ہوئے اس کا صحیح اندازہ ان کے ادبی مضامین پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ جن کے ایک ایک لفظ میں عورت سانس لے رہی ہے۔

حسن و عشق کے موضوع پر ان کے چند Aphorisms ملاحظہ ہوں:-

عورت ایک لذت ہے مجسّم ـ ایک سحر ہے مرئی ـ ایک نور ہے مادی ـ

عورت ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں، ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں ـ وہ ایک شیرینی ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے، ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سُنی جاتی ہے۔

اگر عورت کو خود مرد سنگدل بنا دے تو پھر اس کی تلافی جان دینے سے بھی نہیں ہو سکتی۔

جب عورت کسی مرد کے اندر جذباتِ عشق کی شدت محسوس کرتی ہے تو اس کا پندار خدا کا سا پندار ہو جاتا ہے۔

محبت ایک قسم کی نکہت ہے جو روح کی شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے۔

عورت کی تنہائی ایک راز ہے جس کو مرد نے ہمیشہ سمجھنا چاہا اور کبھی نہیں سمجھ سکا۔

نیازؔ کی ادبی زندگی جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکی ہوں، بڑی حد تک ان کی رومانی زندگی کا منطقی نتیجہ تھی، جس کو انھوں نے کبھی نہیں چھپایا اور میں نیازؔ کو سب سے بڑا ادیب اسی لئے سمجھتی ہوں کہ انھوں نے کبھی "نمائشِ تقدس" سے کام نہیں لیا، انھوں نے محبت کھلم کھلا کی، اور کبھی اس پر تصوف و افلاطونیت کا پردہ نہیں ڈالا۔

پھر ہو سکتا ہے کہ کسی وقت کوئی مولوی منش سوانح نگار اس چیز کو سامنے رکھ کر ان کو بد اطوار انسان قرار دے، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ نیازؔ کی عظمت کا راز محض ان کی صداقت ہے۔ یعنی ان کی زبان پر وہی آتا ہے جو ان کے دل میں ہوتا ہے یہاں تک کہ ان کی بے باکی صرف "حسن و عشق" ہی کی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ مذہب تک بھی پہونچی ہوئی ہے اور اتنی شدت کے ساتھ کہ ایک مولوی کی زبان میں اس کا نام صرف "ارتداد و الحاد" ہے۔ اور نیازؔ کی یہ فطری خصوصیت سعدیؔ کے اس شعر کی مصداق ہے کہ:-

بہ ہیچ کس بدِ دامن ترنیست اما پیش خلق | بعض می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

ان کے مکاتیب دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی خط و کتابت متعدد عورتوں سے رہی ہے جن میں سے بعض کا علم مجھے بھی ہے ان میں ایک خاتون رام پور کی تھیں، جن کو نیاز صاحب نے کبھی نہیں دیکھا، لیکن وہ خود ان کے حالات سے بہت واقف تھیں۔ ان محترمہ نے مذہب، سیاست، شعر و سخن وغیرہ مختلف مسایل پر خط و کتابت کی لیکن بعض خطوط ایسے بھی تھے جو صرف جذبات سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا جواب بھی نیاز نے اسی رنگ میں دیا (افسوس ہے کہ یہ خاتون اب اس دنیا میں موجود نہیں)

محترمہ، ہرچند، آشنا گاہے، گہے ناآشنا، والی ادا مجھے پسند نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ کا کبھی کبھی یاد کر لینا بھی "جلوۂ برقِ شرابِ نگاہ گاہ گاہ" سے کم نہیں، مہینوں اُس طرف کی بات ہے جب آپ کی آخری تحریر رامپور سے وصول ہوئی تھی اور ہرچند اس میں کافی برہمی کا اظہار کیا گیا تھا، لیکن چونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، میں بھی حسب عادت ایک آہ سرد بھر کر خاموش ہو رہا اس وقت اس نزاع کو تازہ کرنا مناسب نہیں کہ آپ نے ہمیشہ میری اس معذرت خاموش کو "خودسری" پر محمول کیا اور میں نے بے کسی و بیچارگی پر، اب آپ نے پھر "ساحل اپالو" سے مجھے یاد فرمایا تو خیال آیا کہ اس داستان کا گزشتہ باب شاید اس سین پر ختم ہوا تھا!

زلفِ برہم نثارِ مستیِ چشم

اچھا یہ تو بتایئے کہ اب کیا ارادہ ہے، وہی، ابتلا و آزمایش، وہی امتحانِ صبر و وفا اور وہی مطالبۂ "گنج دارد دریز" مناسب ہے۔ اسلام کی شرط "ورزش ایمان بالغیب" ہو یا نہ ہو لیکن محبت و خلوص کے معاملہ میں میرا اصول ہمیشہ یہی رہا ہے، اس لئے صبر نہ کروں گا تو کیا کروں گا۔

سیاسیات کے باب میں بڑی حد تک میں آپ کا ہم خیال ہوں، لیکن اسلوب کار میرا اور ہے، آپ کا اور، تقریروں کے متعلق آپ نے خوب رائے دی۔ انتقاد آپ کا حقہ ہے — اور ہاں یہ تو بتایئے اب آپ ہیں کیسی؟

پروانۂ راہداری عطا ہو تو حاضر ہوں۔

اسی طرح بھوپال کی ایک خاتون سے عرصہ تک خط و کتابت جاری رہی، لیکن جب ان کی شادی ہونے لگی تو انھوں نے لکھا کہ اب سلسلۂ مراسلت جاری رکھنا مناسب نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نیاز صاحب براہ راست انھیں نہ دے سکتے تھے اس لئے اسے "نگار" میں شایع کر دیا۔

میں سمجھتی ہوں کہ نیاز صاحب کے تمام اُن مکاتیب میں جو انھوں نے خواتین کے نام لکھے ہیں یہ خط خاص اہمیت رکھتا ہے نہ صرف انشا پردازی کے لحاظ سے بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں وہ ہم کو بہت زیادہ بے نقاب نظر آتے ہیں۔

یہ خط جولائی سنہ ۱۹۳۳ء کے "نگار" میں شایع ہوا اور اس کا عنوان تھا "وہ خط جو مکتوب الیہ تک نہ پہونچ سکا" ملاحظہ ہو:-

اتنا قاتل خط اور اس قدر طویل! — تم تو صرف یہی کہنا چاہتی تھیں نا، کہ آیندہ میں تمھیں کوئی خط نہ لکھوں پھر یہ پورے چھ صفحے کیوں؟ — شاید اس لئے کہ صاف صاف ایسا کہتے ہوئے تم کو حجاب آتا تھا۔

میں سمجھتا ہوں ——— نہیں یہ بات نہیں

تم نے مجھے آہستہ آہستہ ذبح کرنا چاہا — اس طرح کہ حلق پر چھری بھی چل رہی ہے، تم مسکرا مسکرا کر مجھ کو تسلیاں بھی دیتی جاتی ہو، اور میں بے خبر ہوں، یہاں تک کہ دفعتاً تمھارا ہاتھ شہ رگ تک پہونچ جاتا ہے

یعنی تمھارا خط ختم ہو جاتا ہے اس حکم کے ساتھ کہ آیندہ تمھیں کوئی خط نہ بھیجوں ——— اور ——— مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نہایت بیش قیمت چینی کی قاب دفعتاً ہاتھ سے چھوٹ جائے اور فرش پر گر کر چور چور ہو جائے۔ لیکن خیر اس سے ایک فایدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ تم نے خط لکھنے سے باز رکھ کر مجھے اس کا موقع تو دیدیا کہ جو کچھ کہنا ہے آزادی سے کہدوں اور دل کی وہ ہر بات جو تم پر ظاہر نہ کرسکتا تھا، کہہ ڈالوں۔ کیونکہ اب مجھے کیا ڈر ہے۔ تم سُن نہ سکوگی اور دُنیا سُنتی ہے تو سُنے ——— اچھا تو شروع کرتا ہوں

ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ ....!

تمھاری سب سے پہلی تحریر مجھ تک پہونچی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ اگر یہی باتیں میں تمھاری زبان سے سُنتا تو کیا ہوتا ——— تمھیں خبر نہیں لیکن ہوا یہی!

میں نے تمھاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو دیکھ کر، حرفوں کی ہر ہر کشش کو سمجھ کر، کاغذ کے رنگ اور اس کی عطریت سے مدد لے کر، میں نے تمھاری ایک تصویر کھینچی، کاغذ پر نہیں، قلب پر، دماغ کے اس پردہ پر جو صرف نغمہ و نکہت کے نقش کے لئے مخصوص ہے اور میں اس میں محو ہو گیا ——— تو کیا میں بتا ہی دوں کہ میں نے تمھاری تحریر کے اندر چھپا ہوا تم کو کیسا پایا؟ ——— معاف کرنا، ممکن ہے کوئی بات خلاف حقیقت ہو یا تمھارے ذوق کے خلاف ——— لیکن جب میرا یہ خط تم تک پہونچ ہی نہیں سکتا تو پھر یہ اندیشہ کیوں ——— ؟

اچھا تو سنو اب تم اپنا سراپا ——— کوئی پسند کرے یا نہ کرے لیکن مجھے تو وہ اس قدر عزیز ہے کہ اگر تم واقعی ویسی نہ نکلیں تو مجھے افسوس ہوگا!

کھلتا ہوا سانولا رنگ، یعنی وہ رنگ جو کیفیات سے شروع ہوتا ہے اور کیفیات ہی پر ختم ——— وہ، جسے دیکھ کر چھونے کو جی چاہے اور ہونٹوں میں بے اختیار کپکپی سی محسوس ہونے لگے ——— معاف کرنا میرے ہاتھوں نے کبھی تمھیں چھُوا، اور میرے ہونٹوں نے کبھی تمھارے لبوں کو مس کیا جو ریشم کی طرح نرم اور پنکھڑی کی طرح نازک تھے ——— میں نے تم کو نحیف و ناتواں پایا، لیکن اپنی رعنائی و کشیدہ قامتی کے لحاظ سے تمھیں ایسا ہونا ہی چاہئے ——— تمھارے بال بہت سیاہ تو نہیں، لیکن ان میں ایک خاص قسم کی چمک ضرور ہے اور تھوڑا سا گھونگھر بھی کنپٹی کے بالوں میں مجھے نظر آتا ہے ——— پیشانی بہت فراخ ہے اور اس میں ایک میگوں رگ، ابھری ہوئی مانگ تک چلی گئی ہے ——— بھویں کافی چوڑی ہیں اور ایک نہایت ہلکی عنبری لکیر ان دونوں تلواروں کو ایک دوسرے سے ملا رہی ہے ——— رنگ کے بعد سب سے زیادہ قاتل چیز تمھاری آنکھیں ہیں، ہر وقت کسی خیال میں مستغرق رہنے والی آنکھیں جن کو ایک بار دیکھ لینا گویا کسی سمندر میں ڈوبتے چلے جانا ہے ——— چہرہ کتابی ——— گردن کھنچی ہوئی، تناسب اعضا کانٹے پر تلتا ہوا ——— اور ——— چال ایسی جیسے کوئی ناگن راستہ کاٹتی ہوئی ہوئی سامنے سے گزر جائے عمر تم خود ہی بتا چکی ہو کہ ۲۰ سے کم اور ۱۵ سے زیادہ ہے۔ غالباً ۱۸ سال ——— !

یہ تھی تمھاری وہ تصویر جو میں نے تمھارے سب سے پہلے خط کو دیکھ کر اپنے دل پر نقش کی تھی اور اگر میں یہ سب کچھ پہلے ہی لکھ دیتا تو شاید تم اسی وقت مجھے لکھ بھیجتیں کہ "آیندہ میرے نام کوئی خط نہ بھیجا جائے"۔

میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ بے تکلف ہو جاؤ، اور میں تم کو ایسے لفظ سے خطاب کر سکوں جو تمھاری خوبصورت پیشانی پر ہلکا سا خم پیدا کر سکے۔ لیکن اچھا ہوا کہ اس منزل تک پہونچنے سے پہلے ہی یہ بساط اُلٹ دی گئی اور تم نے زندگی کی اس تلخ حقیقت کو جان لیا کہ اگر عورت اس کے سمجھنے پر مجبور نہ ہو تو خدائی کا دعویٰ بھی اس کے لئے کوئی بڑی چیز نہیں۔

ہر چند میں تم کو دنیا میں آزاد، انسانی دسترس سے دور، کسی آسمانی دیوی کی طرح بلند دیکھنا چاہتا تھا، لیکن میری یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور تمھاری زندگی کا وہ دور جب تمھارا جسم تمھاری روح کے اندر محوِ خواب تھا، جلد ختم ہو گیا۔

پھر بتاؤ کہ اب تم کیا کرو گی — مگر میں یہ کیوں پوچھ رہا ہوں، مجھے کیا حق حاصل ہے اور اگر تم کچھ کہنا بھی چاہو گی تو کیسے کہو گی اور اگر کہو گی بھی تو کلیجہ پر کون ہاتھ رکھے گا۔

تمھارے اس چھ صفحہ کی داستان میں سب سے زیادہ تڑپا دینے والی بات یہ تھی کہ تمھارے جسم کے ساتھ تمھاری روح کا سودا نہیں ہو سکا — باور کرو یہ سن کر مجھے بہت قلق ہوا اور دیر تک سوچتا رہا کہ تم کس قدر گھبرا رہی ہو گی۔ لیکن میں تو اب تسکین کے الفاظ بھی تم تک نہیں پہونچا سکتا، کیا کروں مجبور ہوں — اچھا تو لو اب میں بھی اپنی تسکین کی چیزیں اپنے سے جدا کئے دیتا ہوں اور تمھاری تمام تحریریں جن کو میں نے اس وقت تک حرزِ جاں بنا کر رکھا تھا، نذرِ آتش کئے دیتا ہوں۔

اے عزت و شرافت کی دیوی —— میری یہ قربانی قبول کر لے

نیاز صاحب کا صرف یہی ایک خط ان کے جنسی و جذباتی تاثرات کے سمجھنے اور ان کی انشاپردازی پر مہرِ دوام ثبت کرنے کیلئے کافی ہے

اس نسل کے مشاہیرِ نقد و ادب یوں جو چاہے کہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان میں سے اکثر نے نیازؔ کی تقلید کی اور کسی کو یہ اندازِ بیان نصیب نہ ہوا۔

اس میں شک نہیں نیاز بڑی زبردست شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی انشاپردازی پچھلی نصف صدی کا بہت بڑا معجزہ ادب۔ جس کا احساس خود ان کو بھی ہے۔ چنانچہ ایک بار کوئی طالب علم ان سے آٹوگراف لینے آیا (میں بھی موجود تھی) انھوں نے اس کی بیاض پر ایک شعر لکھا:۔

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

اور نیچے اپنے دستخط اس طرح کئے:۔ "نیاز آخر الزماں"

نیاز کی انشا پردازی، اپنے اسلوب کے لحاظ سے دو حصّوں میں منقسم ہے، ایک وہ جس کا تعلق ان کے ادبی مقالات اور Essays سے ہے اور دوسرا وہ جو ان کے مکاتیب کے لئے مخصوص ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اوّل الذکر ان کی جنبشِ قلم ہے اور دوسری جنبشِ زبان، یعنی ایک جگہ وہ ادب لکھتے ہیں اور دوسری جگہ اسے بولتے ہیں وہ Canvas کی نقاشی ہے اور یہ Free hand Sketching

ایک دو بات، وہ یہ کہ اشعار کا صرف کرنے میں نیاز کا کوئی مثل نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعر صرف اسی موقع کے لئے لکھا گیا تھا جس جگہ نیاز نے اس کا صرف کیا ہے۔ اور ان کی یہ خصوصیت ان کے مکاتیب میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔

ادبی مقالات کی طرح وہ مکاتیب میں بھی مختلف مسایل پر اظہارِ خیال کرتے ہیں، لیکن دونوں کا اسلوب بالکل ایک دوسرے سے جدا ہے۔

نیاز بڑے Versatile Talent کے ادیب ہیں اور یہ گوناگونی ان کے مکاتیب میں اتنی کثرت سے پائی جاتی ہے کہ اس کا احاطہ آسان نہیں۔ ذہن و فکر کی کوئی راہ ایسی نہیں جس میں ان کی مشعلِ فکر نے رہبری نہ کی ہو اور زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس پر انھوں نے انتہائی خوداعتمادی کے ساتھ اظہارِ خیال نہ کیا ہو (خوداعتمادی نیاز کی فطرت ہے جو ان کی ہر حرکت و عمل میں پائی جاتی ہے)

مکاتیب میں ہم کو مذہب، تنقید، سیاست و تمدن، شعر و سخن سبھی کچھ نظر آتا ہے اور ایک خاص انداز کی ظرافت و شوخی بھی جو مکاتیبی انشاء کی جان ہے۔

اب میں نیاز کے دوسرے مکاتیب کا انتخاب و اقتباس پیش کر رہی ہوں، جو ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ علمی و افادی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے، وہ یقیناً بہت ناقص و نامکمل ہے، لیکن میں اپنی جگہ بہت مطمئن ہوں، کیونکہ اس طرح کم از کم مجھے یہ سمجھنے، کہنے اور فخر کرنے کا موقع تو مل گیا کہ:

ذرۂ آفتاب تابانیم

"عائشہ"

مرے دل میں ہے غالبؔ "شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں"
خدا وہ دن کرے جب اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

نیازؔ کے چند خطوط بعض خواتین کے نام جن میں بقول غالبؔ "شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں" بھی ہے اور اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔

وہ خطوط جن میں علیگڈھ والہ آباد، دہلی، ڈیرہ دون اور فیض آباد کا ذکر ہے، وہ شفیق بانو سے متعلق ہیں جو آج کل پاکستان میں ہیں۔ وہ مکاتیب جن میں رام پور، بمبئی و بھوپال کا ذکر ہے، وہ رام پور کی شکیلہ بانو اور بھوپال کی ن۔ بانو کو لکھے گئے تھے۔ بعض خطوط میں ضلع بارہ بنکی کی ایک خاتون نسیم بانو سے خطاب کیا گیا ہے۔

"عائشہ"

---

(۱)

تقریبِ ملاقات ــــ نیاز نوازا ــــ ! ــــ دُنیائے شاعری میں تو یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ذراسی لغزشِ پا انسان کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے، لیکن اس "دو اور دو چار" کی دنیا میں کسی غلطی کا۔ "حقیقت" میں تبدیل ہو جانا شاذ و نادر ہی کبھی دیکھا جاتا ہے ــــ اگر اجازت ہو تو اپنی اس غلطی کو بھی انھیں "نوادر" میں شمار کروں، ممکن ہے "اظہارِ تشکر" والی خاتون پر آپ کو برہمی ہو، لیکن کم از کم میں تو ان کا از بس ممنون ہوں کہ "آگ کی جستجو میں جانا اور پیمبری لے کر پلٹنا" موسیٰ کے بعد سے اس وقت تک تو کبھی دیکھا نہیں گیا۔

آپ کا خط پڑھنے کے بعد دو متضاد کیفیتیں مجھ پر طاری ہوئیں، ایک مسرت وانبساط کی دوسری تاسف و برہمی کی۔ وہ اس لئے کہ آپ کی تحریر میں مجھ کو وہ سب کچھ نظر آیا جو کسی ہستی کو ادبی دُنیا میں پرستیدۂ عام بنا سکتا ہے اور یہ اس لئے کہ میں کیوں اس وقت تک آپ سے بے خبر رہا۔

مجھے ایک زمانہ سے تمنا ہے کہ نگار کسی ایسی خاتون کو پیش کر سکے جو ادب میں میری تمناؤں کو پورا کرنیوالی ہو لیکن اس وقت تک کامیاب نہ ہو سکا ــــ ایک اور صرف ایک ملین بھی تو "موجِ کوثر و تسنیم" والی کہ "خرابِ محبت" ہونے کی وجہ سے شاعری میں تو یقیناً ان کا جواب نہیں، لیکن یوں۔ وہ ایک پتھر کی دیوی ہیں جس کے سامنے سر تو پھوڑا جا سکتا ہے لیکن زبان نہیں ہلائی جا سکتی۔

بھوپال اور بھوپال کی ہر چیز سے مجھے اُلفت ہے، اس لئے یہ معلوم کر کے کہ آپ کا تعلق اسی سرزمین سے ہے، یوں بھی ایک خاص کشش آپ میں پاتا ہوں اور متمنی ہوں کہ اس حد تک ضرور، آپ مجھ سے بے تکلف ہو جائیے کہ اس بُعدِ مکانی کو اپنے تصورِ خیال کی مدد سے دور کر سکوں

(۲)

لطفِ انتظار —— محترمہ! —— اشعار ملے اور تمام ان دردمی انیوں کے ساتھ جو بقول آپ کے آپ کی زندگی کا سہارا ہیں لیکن میرے نزدیک موت کا کفارہ نہیں، آپ کو معلوم نہیں "موج کوثر و تسنیم" کے لئے دُنیا نے کتنی بار مجھ سے مطالبہ کیا اور میں نے ہمیشہ یہ کہکر ٹال دیا کہ دیکھا جائے گا۔ میں کسی سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کون ہیں اور کیوں اپنے کلام کی اشاعت گوارا نہیں فرماتیں۔

باور کیجیئے کہ آپ کی داستانِ غم سننے کے بعد بھی مجھ پر اتنا اثر نہیں ہوا، جتنا آپ کے کلام —— سے شاید اس لئے کہ جو نگاہ آئینے سے اُچٹ کر آتی ہے وہ زیادہ قاتل ہوتی ہے۔

آپ کب تک لکھنؤ آئیں گی، غالباً محرم میں "ہاں، نہیں" دونوں صورتوں میں آپ کا سکوت ہی مناسب ہے، میرا لطفِ انتظار آپ کیوں غارت کریں؟

(۳)

تعزیت —— محترمہ —— آپ کی طویل خاموشی سخت دلخراش تھی، لیکن خلاف توقع نہ تھی، میں جانتا تھا کہ آپنے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھالی ہے اور میں خود اس کی ابتدا کرتا اس کا امکان صرف اس صورت میں تھا کہ حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پاتا۔

شکر ہے کہ آخر کار آپ کو رحم آہی گیا اور مجھے، کہ اب تنکے کا سہارا بھی ہاتھ سے جا رہا ہے، ڈوبنے سے بچا لیا۔

سانحہ کا حال معلوم کرکے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ آپ کی آغوش سب سے پہلی مرتبہ آباد ہو کر یوں اُجڑ جائے! قیامت ہے قیامت

شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

کفارہ کا روزہ رکھنے میں کیا نقصان ہے۔ کیا وہ قسم سے زیادہ مضبوط چیز ہے۔ جس کو دل توڑنے میں باک نہ ہو، وہ روزہ کے باب میں اتنا پس و پیش کرے۔ حیرت ہے۔ خدا کرے آپ جلد یہ خبر سنائیں کہ اُجڑی ہوئی آغوش پھر آباد ہو گئی ہے۔

(۴)

احساسِ نارسائی —— آپ وہ باتیں کیوں لکھا کرتی ہیں جن کے جواب میں سوا "احساسِ نارسائی" کے اظہار کے اور کچھ نہ کہہ سکوں

بحرف آمدی و زخم کہنہ ام نو شد
بحیرتم چہ نمک بود گفتگوئے ترا

آپ نے جس جرأت و جسارت سے ان کو جواب دیا ہے وہ اس سے زیادہ داد کا مستحق تھا جو آپ کو ملی۔ ممکن ہے کہ آپ چھپاتی ہوں —— خیر!

غزل میں اتنا شدید جذبۂ سپردگی و وارفتگی اور اس پر آپ کا یہ کہنا کہ کسی سے آج تک محبت کی ہی نہیں، حیرت ہے۔

کفارہ کے سلسلہ میں آپ روزے بھی رکھیں گی اور مسکینوں کو کھانا بھی کھلائیں گی، خیر روزہ رکھنے میں تو کوئی حرج نہیں اچھا ہے "رنگ کھلتا جائے گا جتنا کہ اُڑتا جائے گا" لیکن دوسری بات بہت خطرناک ہے۔ آپ نے ہندی کا دوہا نہیں سنا جس کا مفہوم یہ ہے کہ "غربا کو غلہ تقسیم کرنے کی خدمت بہو کے سپرد کی گئی اس خیال سے کہ اس کے ہاتھ چھوٹے ہیں خرچ کم ہوگا، لیکن وہاں ساری دنیا بھکاری بن کر جمع ہو گئی ——"

(۵)

تشکرِ ہدیہ ——— آپ عید کی مبارکباد دیتی ہیں، حالانکہ

عید را در شہرِ ما رسمِ مبارکباد نیست

لفافہ کے اندر ایک چیز اور بھی ملی بہتر ہے،

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

میں جانتا ہوں کہ آپ سے دل آزاری ممکن ہی نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ "شیوۂ دلداری" بھی کبھی ایک مستقل آزار ہو جاتا ہے اُن کے لئے نہیں جو ہر وقت آپ کے ساتھ ہیں اور اس کے خوگر ہو چکے ہیں، بلکہ اُن کے لئے جو آزادی سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں ———" تو خود حدیثِ مفصل بخواں ازیں مجمل

(۶)

ماضی کی یاد ——— جانِ نیاز ——— جس کے خیال سے روح "اہتزاز" میں آجائے، اس کی تحریر دیکھ کر کیا کیفیت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کسی کے بس کی بات نہیں۔

دُنیا کی اور بہت سی نعمتوں کی طرح، آپ کو بھی ہاتھ سے کھو چکا تھا، اور عرصہ ہوا آنسو خشک کر کے بیٹھ رہا تھا لیکن اب کہ آپ کی تحریر نے پورے پچیس سال پہلے کی دنیا میرے سامنے پیش کر دی ہے، خدارا، آپ ہی بتائیے کہ زمانہ کے اس تفاوت کو کیونکر شادوں وہ آپ کے نرم و نازک ہاتھ، اور وہ میرے دل کی مسلسل دھڑکن۔ وہ آپ کا معطر رومال اور وہ میرے گرم گرم آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب۔ یہ آپ نے کیا کیا ——— اُف،

برقِ یمانی بہ جست بادِ بہاری بجاست

طاقتِ مجنوں برفت خیمۂ لیلےٰ کجاست

(۷)

حرفِ شکایت ——— یہ آپ کی "پرسشِ گاہ گاہ" بڑی تکلف دہ چیز ہے۔ بمبئی کی اس تحریر کے بعد، جس کا جواب براہِ راست آپ تک نہ پہونچ سکتا تھا، آپ نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ میں متفکر تھا کہ آپ کی صحت کا حال کیونکر معلوم کروں، آپ کی وہ باتیں جو انسان کو پروانہ کی طرح "نیمۂ داغ و نیمۂ خاکستر" بنا دیتی ہیں، کس طرح سنوں، لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی آخر کار مایوس ہو گیا، اب کئی مہینے کے بعد آپنے پھر یاد فرمایا لیکن نہایت رواداری میں جس طرح سرِ راہ کسی سے ملاقات ہو جائے۔

شکر ہے کہ آپ صحیح و توانا ہیں۔ میں بھی اچھا ہوں لیکن جس وقت یہ دیکھتا ہوں کہ :- "موسم دیر غنود ن پر شبستاں آمد" اور اس کا کوئی سامان موجود نہیں تو پھر مضمحل ہو جاتا ہوں کیا آپ نے کبھی داغؔ کے اس شعر پر غور کیا ہے :-

چمپا کھلا، گلاب کھلا، موتیا کھلی

دل کی کلی نہ تجھ سے مگر اے صبا کھلی

اس شعر میں مجھے صرف "تجھ سے" کی تفسیر آپ سے پوچھنا ہے لیکن نتیجہ معلوم !

"پردہ ڈالا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے" خوش رہئے اور کیا کہوں

(۸)

شکوۂ تلخ ——— اللہ، اللہ، یہ برہمی، خوبصورت پیشانی کی یہ خوبصورت شکنیں! پھول سے رخساروں کے نیچے یہ دہکتی ہوئی آتشِ گل، یہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے نکلنے والے شعلے!!

معاذاللہ! ——— آتشم تیز ست و داماں می زنم

ہاں، ہاں، میں چنگیز ہوں، ہلاکو ہوں، نیرو ہوں اور وہ سب کچھ ہوں جو آپ کے "لبِ لعلیں" مجھے بنادیں، لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ میں محبت کی اس منزل سے گزر رہا ہوں جہاں نہ شکوہ و شکایت کی گنجائش ہے نہ شکر و تہنیت کی۔

مجھ پر افسردہ و ملول ہونے کا طعن کیا جاتا ہے لیکن تھوڑی دیر کے لئے آپ ہی کی نگاہیں جھک جاتیں تو کیا قیامت آجاتی! میں نگاہ سے بھی محروم اور تمنا سے بھی، لیکن وہ جو نگاہ سے محروم ہے نہ تمنا سے، سراپا معصوم! یہ کیا انصاف ہے، کیا شیوۂ دلربائی ہے!

خرمنِ دل گر ہماں شمع وفا باید نہ برق

خاطرِ پروانہ از ہر آتشے خرسند نیست

بے شک آپ نے جواب کی خواہش نہ کی تھی، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ میں آپ کی ہر خواہش کو پورا کروں، جبکہ آپ میری ایک خواہش بھی پورا کرنے کے لئے آمادہ نہیں، اس کے جواب میں مجھ سے اس خواہش کی صراحت کا مطالبہ نہ کیجئے گا، ورنہ پھر میں بے اختیار ہو جاؤں گا اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ:۔

با دل شدگاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

بہر حال صلح و آشتی کو کافی زمانہ گزر چکا ہے، اب کچھ دن لڑائی میں بسر ہونے دیکھئے۔ کیا حریم ناز کی اونچی اونچی دیواروں سے سر پھوڑنے کا کام نہیں لیا جاسکتا؟ اور پھر یہ کہ آپ کا اس میں نقصان ہی کیا ہے۔

عہدِ وفا ز سوئے تو نا استوار بود

بشکنی و ترا بہ شکستن گزند نیست

(۹)

حسرتِ ناکامی ——— ہارے آپ نے یاد تو کیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ برہم ہوگئیں اور اب کبھی۔ منیں گی، مگر میری سمجھی ہوئی کوئی بات بھی صحیح نکلی ہے جو یہ صحیح نکلتی اور سچ پوچھئے تو میں اسی امید پر جی رہا تھا، ڈرتا ہوں اُس وقت سے جب مجھے آپ کی محبت کا یقین آجائے کہ پھر تو آپ کی عداوت مسلّم ہے۔

آپ نے سیاحتِ کشمیر کا ارادہ کیوں کیا، مگر وہاں آپ کے جذبۂ خود پسندی کی داد شاید پوری طرح نہ مل سکے بدخشاں سے لعل آتے ہیں وہاں بھیجے نہیں جاتے۔ اور پھر قیامت یہ ہے کہ آپ تنہا نہیں جارہی ہیں، بے پردہ جارہی ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ:۔

با سایہ ترا نمی پسندم

اب فرمائیے آپ کیا کہتی ہیں۔

(۱۰)

جلی کٹی ——— عتاب نامہ پہونچا

پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں ہائے دشنام ناتمام کسے

جلی کٹی کا لطف اس وقت ہے جب شاہد و مشہود دونوں یکجا ہوں آپ نے کوئی الزام قایم کیا، میں نے اسے رد کردیا، آپ کو اس پر غصہ آیا، میں خاموش ہوگیا۔ میری خاموشی پر آپ کی برہمی اور بڑھی، میں ہنس پڑا۔

اب آپ ہی بتایئے کہ سرکار کی آشفتگیٔ مزاج کا کیا عالم ہوگا جب پورے چھ دن کے بعد آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ مجھ پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا اور میرے دل پر کیا گزرے گی جب میں یہ سوچوں گا کہ آپ مسلسل ہونٹ چبارہی ہیں اور میں اس منظر سے دور ہوں۔ ہاں تو میں کیا کہوں؟ صاف صاف کہئے چھپانے کی ضرورت نہیں ——— "تمھیں ڈر کس کا ہے؟" لیکن یہ یاد رہے کہ باوصف ان تمام باتوں کے آپ سا "اداشناس" دنیا میں اگر کوئی ہے تو صرف میں! کیوں ہے نا یہی بات؟

اچھا تو فیصلہ یوں ہونا چاہئے کہ "سخن طرازی و دانش" کا دعویٰ میں ترک کرتا ہوں اور "نالۂ حزیں" قبول کرنے کا وعدہ آپ کیجئے، یعنی نہ میں یہ کہوں کہ صرف میں ہی آپ کا "گناہگار" ہوں اور نہ آپ سوا میرے کسی اور کو "مستحق کرامت" ٹھیرائیں۔

وہ شخص جو انتظارِ ساغر میں زندگی بسر کر رہا ہو، اُس کے سامنے آپ خم کے خم لنڈھا دینے کی داستان بیان کریں! کس قدر ظلم ہے؟

بےکس دلم، غریب دلم، بے نوا دلم!

یہ تو خیر جواب تھا صرف آپ کی شوخیوں کا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود حد درجہ نادم ہوں اور اگر آپ کا خط نہ آتا تو آپ کو مخاطب کرنے کی جرأت، شاید اب بھی نہ کرسکتا۔

آپ کے شکوہ و شکایت نے اعتمادِ محبّت میرے دل میں پیدا کردیا ہے اس کی بنا پر چند روز زندہ رہنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ آپ اس کی اجازت دیں۔ بولئے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

دامانِ چاکِ چاکِ گریباں دریدہ را

(۱۱)

تلخیٔ رشک ——— نیاز نوازیوں کا شکریہ، لیکن آپ نے یہ کیا فرمایا کہ آپ سے دور ہوکر میں نے آپ کو بھلادیا ہے، شاید آپ کو معلوم نہیں کہ:-

مانندِ شعلہ، حسنِ ترا، پشت و رو یکے ست

آپ سامنے ہوں یا نہ ہوں:-

"عالم ہے وہی جلوہ گری کا!"

قدرت کی طرف سے جن کے لئے زخم کھانا اور تڑپنا مقسوم ہوچکا ہے اُن کے لئے آپ کو کیوں اتنی فکر رہتی ہے، نگاہوں کے نشتر نہ سہی، جنگل کے کانٹے سہی، آپ نہیں، آپ کی یاد تو ہے۔

دل و صد آرزوئے خام، بدل

یار، چندیں قریب و من تنہا

یقیناً پچھلی بار آپ سے بہت رواداری میں ملنا ہوا، مجھے خدا جانے کیا کیا کہنا تھا، لیکن نہ کہہ سکا اور آپ نے بہت سی وہ باتیں کہہ ڈالیں جو نہ کہنا چاہئے تھیں، چنانچہ آپ نے نئے پیدا ہونے والے تعلق کا بھی ذکر مجھ سے کیا تھا؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ تکمیل کو پہونچا یا نہیں؟ تحریر کے سرورق پر جو پتہ درج ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک نہیں ہوا، لیکن ہو سکتا ہے کہ "ہو" مگر اس کا اظہار نہ ہو ــــ کیا کہنا اس دو دھاری تلوار کا!

آپ میرے اس استفسار سے بدگماں نہ ہوں۔ لیکن یہ بھی نہ پوچھئے کہ میں کیوں پوچھتا ہوں، یونہی پوچھتا ہوں ــ

"چہ تواں کرد، مرا با تو سرے افتادست"

اگر فرصت ہو تو کبھی کبھی یاد کر لیا کیجئے۔ اور میری اس حسرت کو کبھی نہ بھولئے کہ

نہ با تو رفتم و نے بے تو در غمت مُردم
یکے ز دست نیامد ازیں دو کار مرا

(۱۲)

تہنیت شادی ــــ محترمہ ، مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ کی زندگی کا وہ دور ختم ہو گیا جس کی آزادی سے لطف اٹھانے کے لئے آپ طیار نہ تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت کی مجبوری و پابندی بھی بجائے خود بڑی پُر لطف چیز ہے اگر تہذیب و تمدن کی پریشاں خیالیاں اس کے سکون کو تباہ نہ کریں۔

یقیناً آپ کے رفیقِ زندگی آپ سے خوش ہوں گے اور دنیا میں وہ کون ایسا ہے جو آپ کو شریک حیات بنا کر مسرور و شادکام نہ ہو آپ کے منفعلانہ انداز کی جسارتیں بڑے بڑوں کو رام کر سکتی ہیں چہ جائیکہ ایک غریب ڈاکٹر جسکی دنیا اعصاب و عضلات سے آگے کبھی نہیں بڑھی گاہ گاہ یاد فرماتی رہئے۔ زندگی کے وہ چند دن جن میں کبھی کبھی آپ کی خجل تبسم فروشیوں سے خاموش لطف اٹھایا کرتا تھا، میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ آپ کی بچی کہاں ہے وہیں علی گڈھ میں یا آپ کے پاس؟

(۱۳)

رازو نیاز ــــــــــــــــــــ اے تو مجموعۂ خوبی بہ چہ نامت خوانم!

پورے دو دن یہ سوچتے ہوئے گزر گئے ہیں کہ آپ کے خط کا جواب لکھوں لیکن باور کیجئے کہ ہمت نہ ہوئی، جب حضوری تھی تب بھی دل ہر وقت کا پُنشار رہتا تھا، اور اب کہ حضوری نہیں وہی حال ہے، آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن خدا شاہد ہے کہ آپ مجھ سے جس قدر دور ہیں اتنی ہی مجھ سے قریب ہیں ــــ اس قدر قریب کہ

"نتواں تر از جاں را بہم امتیاز کردن"

آپ نے جس محبت سے یاد فرمایا ہے اس کا اقتضاء صرف یہ تھا کہ میں خود حاضر ہو کر "خراج نیایش" پیش کرتا لیکن افسوس ہے کہ اس کی اجازت نہیں اور ہو بھی تو مصلحت نہیں، اس لئے آپ ہی بتائیے کہ جو باتیں صرف نگاہوں سے کرنے کی ہیں انھیں الفاظ سے کیونکر ادا کروں۔

آپ کی نئی زندگی سے مجھے دلچسپی تو نہ ہونا چاہئے لیکن اگر آپ کو بھی اس سے دلچسپی باقی نہ رہی تو مجھے افسوس ہوگا،

میرے لئے تو زندگی کے تجربوں میں اب "تلخ و شیریں" کا امتیاز باقی نہیں رہا، لیکن خدانخواستہ اگر آپ کو کسی وقت اس پر غور کرنا پڑا تو مجھے سخت تکلیف ہوگی۔

اگر اجازت ہو تو ایک درخواست پیش کروں، اور وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو مجھے یہ سمجھنے کا موقعہ دیجئے کہ آپ نے مجھے بھلا دیا ہے۔ مجھے زندہ رہنے کا شوق تو نہیں ہے لیکن ضرورت یقینی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ماضی کی تلخ کامیاں مجھے یاد نہ آئیں۔

آپ کے ساتھ میرے ماضی کا تعلق اتنا شدید ہے کہ میں آپ کو "اپنا گزرا ہوا زمانہ" کہتا ہوں، اس لئے آپ کیوں میرے حال پر وہ لطف صرف کریں جس کے تحمل کا حوصلہ اب مجھ میں نہیں — لیکن اگر آپ نے یہی فیصلہ کر لیا ہو کہ بہر صورت مجھے مرجانا ہی چاہیئے تو بسم اللہ:

رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو!

(۱۴)

حرفِ تسلّی —— میں جب کبھی آپ کو خط لکھتا ہوں تو دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ آپ سے خطاب کس طرح کروں، آپ تو "محترم" لکھ کر اس فرض سے بہ آسانی سبکدوش ہو جاتی ہیں — تصنع و تکلف ہی ٹھہرا نا؟ — لیکن میں اس کے جواب میں آپ کو "محترمہ" لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ "احترام" کی حد زیادہ سے زیادہ "حریمِ کعبہ" تک ہے اور میں آپ کو اُس وقت کی چیز سمجھتا ہوں جب کعبہ، کعبہ نہ تھا، بلکہ "بتکدہ" تھا!

خیر، فی الحال اس کو چھوڑئے، لیکن ذرا سوچ کر مجھے بتائیے کہ میں آپ کو کیا لکھا کروں۔ یعنی جو سوچتا ہوں وہی لکھوں یا کچھ اور؟ ہاں مجھے یاد ہے اور اچھی طرح یاد ہے کہ اب سے دو سال پہلے آپ کیا تھیں لیکن اس سے متفق نہیں کہ اب آپ کچھ اور ہو گئی ہیں، دیکھئے عورت کی زندگی میں بڑی چیز صرف اس کا احساس ہے — مرد کو تو خیر ہمیشہ احساس سے جنگ کرنا پڑتی ہے، اور شاید زیادہ تر عورت ہی کے لئے — اور اسی کو حد سے نہ گزرنے دینا اس کی کامیابی ہے۔

حالات کے لحاظ سے احساس میں تغیر پیدا ہونا لازمی ہے اسی لئے اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ شادی ہونے کے بعد بھی آپ عہدِ دوشیزگی کی "رنگین دنیا" میں زندگی بسر کرتی رہیں تو یہ آپ کا ظلم ہے — خود اپنے اوپر!

ماضی کی یاد سے لطف اٹھانا برا نہیں، لیکن اس یاد سے حال و مستقبل تباہ کرنا حماقت ہے — بے شک بہت سی خلاف توقع باتیں آپ کے سامنے آرہی ہوں گی لیکن اتنے دنوں تک آپ نے پھولوں کی سیج پر راتیں گزاری ہیں اب کچھ لطف خارزار کا بھی اٹھائیے اور اگر آپ نے اسے گوارا کر لیا تو پھر کانٹوں پر بھی نیند آنے لگے گی۔

مجھے یقیناً آپ کے ساتھ ہمدردی ہے، لیکن کیا کر سکتا ہوں جب کہ میری کوشش کی نوعیت بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی شخص سورج سے صرف اس کی روشنی لے کر حرارت کو واپس کر دینا چاہے!

جن سے آپ کی قسمت وابستہ ہے، ان کو میں نے دیکھا تو نہیں لیکن یہ جانتا ہوں کہ کوئی شخص انسان کو بے چین کر کے خود بھی عرصہ تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا، اس لئے آپ رواداری سے کام لئے جائیے، وہ کب تک اپنی غلطی کو محسوس نہ کریں گے۔

آپ آئندہ کوئی خط مجھے ان کو دکھائے بغیر نہ بھیجئے، ورنہ ممکن ہے اس سے گتھیوں میں اور اضافہ ہو جائے۔

۱۵

شکوۂ ناتمامی ـــــ بجا ہے۔ صرف ایک بار گلہ کیا تھا، اور وہ بھی "ناتمام" کہ آسمان زمین آپ نے ایک کر دئے اور اب چاہتی ہیں کہ جو کچھ کہنا ہے دل کھول کر کہہ دوں معقول --!

ملتے دگر فتادہ ہمانا ز بام تو

اگر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اخیر میں آپ مجھے، موردِ الزام قرار دیں۔ تو یہ کاوش بے کار ہے، کیونکہ "آپ سے دور ہوں اور جی رہا ہوں"۔ یہی ایک جرم اتنا بڑا ہے کہ آپ جس قدر ملامت کریں کم ہے۔ زیادہ چھان بین کی ضرورت کیا؟

میں نے تو صرف پوچھا تھا کہ "آشنا گاہے، گہے ناآشنا" والی ادا آپ کی عام ہے یا صرف میرے لئے مخصوص! آپ نے اس کے جواب میں "فلسفۂ محبت" اور "نکاتِ عشق" پر ایک لکچر دے ڈالا۔ حالانکہ:-

گر گفتۂ زعشق گہے حرفِ آشنا

آں ہم حکایتے ست کہ از ما شنیدۂ

میں نے اس پر پوچھا کہ کیا "عورت زیادہ پڑھ لکھ کر صرف بقراط ہی بن سکتی ہے؟"۔ اس کا جواب دراصل یہ ہونا چاہئے تھا کہ آپ ہنس دیتیں۔ اور یاد رکھئے اسی خیال سے میں نے لکھا بھی تھا۔ لیکن خلافِ امید آپ اور سنجیدہ بن گئیں۔ اگر آپ برہم ہوتیں، تو بھی میں اس سے لطف اٹھا لیتا لیکن اس "بقراطیت" کو کیا کروں، آپ ہی بتائیے؟

دیکھئے اس کے جواب میں آپ چاہے رابعہ بصری ہی کیوں نہ بن جائیں، لیکن خاموشی کی سند نہیں۔ ورنہ پھر میری "بت پرستی" کا سارا مظلمہ آپ کی گردن پر ہوگا!

(۱۶)

یادِ ماضی ـــــ محترمہ! --- میں اپنی بدنصیبی کا رونا کہاں تک روؤں، ایک وقت تھا

کہ می رفتی و طاقت می رمید از من

یا اب یہ حال ہے کہ آپ سے ملنے کا خیال بھی کوئی مسرت نہیں پیدا کرتا۔ اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے!۔ تاہم آپ کی دل پرسی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یہ آپ نے خوب فرمایا کہ میں دونوں جہاں سے آزاد ہو گیا ہوں، کاشکے ایسا ہی ہوتا۔ بہر حال خوش ہوں کہ گفتگو میں میری تمنا کی رعایت اب بھی آپ کو ملحوظ ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ جو بات آپ کہتی ہیں وہ کسی وقت پوری ہو جائے۔ ایک زمانہ تھا جب ہر وقت یہ فکر رہتی تھی کہ:-

تسکیں بجہ بخشم دلِ ہنگامہ گزیں را

یا اب یہ حالت ہے کہ ہزار کروٹیں لینے کے بعد بھی دل میں کوئی غیر معمولی دھڑکن پیدا نہیں ہوتی، ہنگامہ کیسا! اس کا علاج اگر آپ کے پاس کوئی ہو تو بتائیے۔ خالی طنز سے کام نہیں چلتا۔

اُن کے حال سے بالکل بے خبر ہوں، عرصہ ہوا ایک خط علی گڑھ سے آیا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ایک دل اپنے کام کا آخر کار انھیں مل ہی گیا۔ ان کا غیر معمولی سکوت، سکون کی علامت ہے، اس لئے میں بہت خوش ہوں، خدا کرے

ان کا "شوقِ ستم" انھیں ایک جگہ چین سے بیٹھنے کی مہلت دے۔

(۱۷)

شکوۂ خامشی ——— دیکھئے، آپ پھر مہینوں سے خاموش ہیں، اور جب یہ خاموشی دور ہوگی تو حسب معمول اُلٹا الزام مجھی پر رکھیں گی! میں جانتا ہوں کہ عورت کو شکایت میں زیادہ لطف آتا ہے، اور جب کسی طرف سے کوئی بات شکایت کی پیدا نہ ہو تو اسے غصّہ آجاتا ہے! لیکن اگر یہ صرف چھیڑ چھاڑ یا گرمیِ محبّت قایم رکھنے کے لئے ہو تو خیر کوئی حرج نہیں، لیکن جب یہ بات نہ ہو ——— تو پھر؟

میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ نئے تعلق سے آپ خوش ہیں یا نہیں، آپ نے اس کا جواب بہت مبہم ـ یا، لیکن انداز تحریر میں ایک چھپی ہوئی آہ محسوس کرکے میں نے عرض کیا کہ ذرا صاف صاف لکھئے، اور اس کے جواب میں آپ نے خاموشی اختیار کرلی۔

آپ کے اس فیصلہ سے میں خوش ہوا تھا کہ آیندہ اپنی زندگی آپ مردوں کی طرح بسر کریں گی۔ اس کے بعد جب آپ نے اپنی لڑکی کو علیگڈھ تعلیم کے لئے بھیجا تو مجھے آپ کے اس عزم کا زیادہ یقین ہوگیا لیکن اس کے بعد دفعتاً آپ نے اپنے نکاح کی خبر سُنائی ـــ اول اول تو مجھے اس کے باور کرنے میں تامل ہوا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ عورت بہر حال عورت ہے اور وہ دوسروں کا سہارا لینے کے بعد ہی خوش رہ سکتی ہے، میں نے اس خبر کو مسرت کے ساتھ سُنا اور بے اختیار جی چاہا کہ کچھ تفصیل معلوم کروں ——— مگر ——— آپ کی مبہم تحریر اور اس کے بعد آپ کے سکوت نے پھر اندیشہ ہائے دور دراز پیدا کر دئے۔

اگر آپ نے پھر وہی غلطی کی ہے جو پہلے کی تھی، تو بھی مجھ سے کہنے میں کوئی حرج نہیں، اگر اس سکوت کا سبب فراغت ہے تو بھی اطلاع دیجئے۔ یہ سُن کر مجھ سے زیادہ خوشی کسے ہو سکتی ہے، اگر نامناسب نہ ہو تو بچّی کے متعلق بھی لکھئے کہ اب وہ کہاں ہے۔ اگر اب بھی علیگڈھ میں ہے تو میں دہلی آتے جاتے اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

(۱۸)

ایک مشورہ محترمہ "خطاب" کی اجنبیت پر آپ کو حیرانی ہوگی! لیکن معاف کیجئے، آپ کا تازہ خط پڑھنے کے بعد تو مجھے "رابعۂ دوراں" لکھنا چاہئے تھا۔ آپ کی ذہنیت کے اس انقلاب کو دیکھتا ہوں اور حیرت کرتا ہوں!

"ختم نبوت" کے متعلق آپ میری رائے دریافت کرتی ہیں۔ میں اس سے پہلے بھی ظاہر کرچکا ہوں اور پھر اسی کا اعادہ کرتا ہوں کہ رسول اللہ بے شک نبی آخرالزماں تھے! کیونکہ اب اگر واقعی کوئی نبی آئے بھی تو اُسے کون مانتا ہے! پچھلا زمانہ ہوتا تو گاندھی جی بھی رسول ہوسکتے تھے! علامہ مشرقی بھی دعویٰ نبوت کرسکتے تھے ـــ اور وہ تو وہ ——— میں بھی نبی بن سکتا تھا (مسیلمہ ہی قسم کا سہی) اور آپ بھی نبیہ ہوسکتی تھیں (سجاح بنت اوس کی سی سہی) گو اُن دونوں کی شادی ہوگئی تھی اور ———"

میں پوچھتا ہوں کہ آپ یہ کس خبط میں مبتلا ہوگئی ہیں، مذہب کو سمجھنے کی کوشش چھوڑئیے، مذہب کو وہی شخص سمجھ سکتا جو پہلے خدا کو سمجھے اور خدا کو سمجھنے میں بیدل کا فیصلہ آپ نے بھی سُنا ہوگا کہ :-

چہ می کردیم یارب گر نبودے نارسیدہا

پھر جس چیز کے سمجھنے کی ابتدا و انتہا "اعتراف جہل" کے سوا کچھ نہ ہو، اس پر غور کرنا حماقت ہے!

آپ کے لئے اصل مذہب بچوں کی صحیح تربیت اور فرائض نسوانی کا ادا کرنا ہے، ان سے کسی وقت فراغت نصیب ہو، اور خدا کو سمجھنے کا جی چاہے تو کائنات کی Comedies کو نہ دیکھئے، بلکہ اس کی Tragedies پر غور کیجئے! اور عہد حاضر کی سب سے بڑی ٹریجڈی موجودہ جنگ ہے اس وقت مذہب سے زیادہ ضروری سیاسیات کا مطالعہ ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق ہماری آپ کی اقتصادی و معاشی زندگی سے بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک آپ کو یہ اطمینان نہ ہو کہ صبح کو آپ کے بچے کیا کھائیں گے، عشاء و تہجد کی نماز بھی آپ سے اچھی طرح ادا نہ ہوگی!

۱۹

معذرت ——— آپ کے عتاب نامہ کا جواب صرف یہ سوال ہونا چاہئے تھا کہ:۔

درکشتنِ من ایں ہمہ بے باک چرائی!

لیکن جانتا ہوں کہ جب "ناز و غمزہ" کا مفہوم صرف "دشنہ و خنجر" رہ جائے تو پھر شہید ہو جانے کے چارہ بھی کیا ہے!

منم کہ بر دل و دینِ خود اعتمادم ہست

بہ نیم غمزہ، ہم ایں را ربائے وہم آں را

میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو "مجروح راوی" سمجھ کر آپ کو اپنے یقین سے شرمندہ نہ ہونے دوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ "نقل و روایت" سے دور اس مسئلہ میں اپنی رائے مجھے "نص قطعی" معلوم ہوتی ہے:۔

در خود نمی شناسم جز دوستی گناہے

تاہم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ محبت کو "ورزشِ ایمان بالغیب" کیوں نہ قرار دیں، اس صورت میں کیا جبرئیل کو بھی جھوٹا کہا جا سکتا ہے۔

یاد رکھئے میرا مقصود یہ نہ تھا کہ خواہ مخواہ آپ کے دل میں کوئی ناروا خلش پیدا کر دوں، اور یہ بات میرے وہم و گمان میں نہ تھی کہ اتنی پختگی کے بعد بھی آپ میں اس قدر خام کاری باقی ہے، لیکن اگر میری تحریر سے آپ کو واقعی کوئی صدمہ پہونچا ہے، تو مجھے اس کا سخت افسوس ہے، معذرت چاہتا ہوں!

آپ ازراہِ شکایت پوچھتی ہیں کہ وہ قاعدۂ مہر و محبت کیا ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

رسمے کہنے بود، بہ عہدِ تو بر افتاد

بولئے، کچھ اور فرمایئے گا؟

حیران ہوں کہ یوں تو مہینوں خاموش رہنا، لیکن جب اس "گناہِ سکوت" کا احساس ہو تو اس کی تلافی میں دوسرے کو اس طرح الزام دینا گویا آپ نگاہ سے بھی کبھی دور نہ ہوئی تھیں! "اللہ، اللہ، چہ جمال ست بریں بوالعجبی؟"

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ یہی سننا چاہتی ہیں، آپ انھیں باتوں سے خوش ہوتی ہیں۔ آپ کی بڑی مسرت اسی میں ہے کہ آپ کی بے نیازی کو محسوس بھی کیا جائے اور اس کا ذکر بھی ہو، لیجئے، یہ فرض بھی ادا ہو گیا، اب کیا ارادہ ہے، وہی

سکوت! وہی رو گردانی! اور وہی

ناز بر خویش و خود نمائی خویش!

(۲۰)

مزاج پرسی ——— محترمہ! مجید صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں، علالت کی تفصیل وہ بتا نہ سکے، تاہم اتنا پتہ ضرور چلا کہ اس کا تعلق "دل" سے ہے۔

چونکہ میں عورت کے دل (اور خصوصیت کے ساتھ "برہم دل") سے بہت گھبراتا ہوں، اس لئے زحمت نہ ہو تو مطلع فرمائیے کہ خدانخواستہ اختلاجی کیفیت تو نہیں ——— جب میں علیل تھا تو آپ نے میرا حال پوچھا اور میں اچھا ہوگیا، اب آپ علیل ہیں اور میں پوچھ رہا ہوں، لیکن نتیجہ کی طرف سے غیر مطمئن!

خدا کرے آپ اپنے جواب سے میرے اس تذبذب کو دور کرسکیں۔ علی گڈھ کی آب و ہوا اگر لکھنؤ سے بہتر نہ ہوتی تو میں مشورہ دیتا کہ یہاں چلی آئیے، تاہم مقام کی تبدیلی کا اثر صحت پر ضرور پڑتا ہے، لکھنؤ نہ سہی، کہیں اور سہی!

(۲۱)

ایک ملاقات کی یاد ——— محترمہ! خط ملا اور بالکل خلافِ توقع، اس لئے غیر معمولی خوشی ہوئی، لکھنؤ میں آپ کا قیام جسے آپ چھ دن کہتی ہیں، اور میں اپنی نگاہ سے صرف ایک ساعت سمجھتا ہوں، یقیناً بڑی خدا ساز بات تھی ——— ایسی ——— کہ شاید اس کا اعادہ ممکن نہ ہو۔

ہر چند بھوپال میں میرے قیام کا زمانہ زیادہ خوشگوار نہیں گزرا، تاہم وہاں کی زمین میں بعض ایسی محبوب و مقدس ہستیاں مدفون ہیں، کہ میں انھیں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اخیر شوال میں حیدرآباد جاتے وقت ایک دن کے لئے وہاں ٹھہر جاؤں ——— لیکن کیوں اور کس کی طلب پر؟ ——— یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میرے متعلق "بری بیا"[1] کے استفسار پر آپ نے یہ خوب کہا کہ "جس حقیقت سے میں خود واقف نہ ہوں، دوسروں کو کیا بتا سکتی ہوں" ——— کیونکہ اس سے کم از کم یہ تو معلوم ہی ہوگیا کہ:-

آگہی بارے کہ آگہ نیستی از ما ہنوز!

"عدمِ علم" کا علم بھی بڑی بات ہے۔

(۲۲)

حرفِ تسلی ——— محترمہ! - خط کا جواب دینے میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی۔ معذرت خواہ ہوں۔ مجھے آپ کی تحریر ملنے سے پہلے ہی سارا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ آپ کو کیونکر تسلی دوں۔

آپ کو افسوس ہونا چاہئے کہ جو کچھ ہوا، آپ کی توقع کے خلاف ہوا لیکن مجھے مسرت ہے کہ جو میں سمجھتا تھا وہی ہوکر رہا میں پرانی داستان دہرا کر آپ کو زیادہ ملول و رنجیدہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن گریۂ و زاری میں سوا اس کے اور ہوتا ہی کیا؟ آپ نے اپنی نسوانی ضد سے کام لیا تھا۔ اب مرد کی بیمہری کا تجربہ کیجئے یہ کوئی نئی بات نہیں، یہی ہمیشہ ہوا ہے اور ہوگا آیندہ کے لئے کیا مشورہ دوں، جانتا ہوں آپ وہ بھی نہ مانیں گی۔ بہر حال اس وقت آپ کو فیض آباد چھوڑ دینا ضروری

[1] پرنسز عابدہ سلطان

اگر آپ اپنے بھائی کے پاس الہ آباد جانا مناسب نہیں سمجھتیں تو یہاں چلی آیئے ۔ میرے پاس نہیں ۔۔ بلکہ صفیہ کے پاس ۔ پھر یہاں بیٹھ کر اطمینان سے سوچا جائے گا کہ کیا کرنا ہے ۔

(۲۳)

گلۂ نارسا ——— کیوں صاحب !

گلہ ہے ہم سے کہ تم ضبطِ گریہ کر نہ سکے
ہنسی جب آ گئی تم کو کب اختیار رہا !

اس سے زیادہ بے کسی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب " ضبط نہ ہو سکنے " کا سوال پیدا ہوتا ہے تو میں اپنے گریہ کے مقابلہ میں آپ کی " ہنسی " کا حوالہ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ ممکن ہے دنیا اس کو صرف تفنن یا کھیل سمجھے ، لیکن جانتا ہوں کہ اس " کمیڈی " میں کیسی ٹریجڈی پنہاں ہے ۔ آپ کے لئے نہیں ، میرے ۔۔ اور ۔۔ اُن سب کے لئے جو محبت میں رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے ۔

آپ سے نہ اس سے قبل میں نے کبھی کوئی شکایت کی ، اور نہ اب اس کی جرأت کر سکتا ہوں ، لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ کے طرزِ عمل کی جھوٹی تاویلیں کر کر کے دل کو تسلیاں دینے کا حق بھی مجھے حاصل نہیں ۔۔۔ اُف !

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجہ ہے ان دل دُکھانے والوں کا

(۲۴)

یادِ ماضی ——— شکایت نامہ کا اتنا پیارا جواب ! گلۂ محبت پر یہ شرم و حجاب ! قیامت ہے ، قیامت !

تغافل کے گلے سُن کر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا ،

میں آپ کی مجبوریوں سے واقف ہوں ، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ بغیر قصد و ارادہ کے آپ کس قدر خوبی کے ساتھ لوگوں کا دل دُکھا سکتی ہیں ۔ پھر آپ وہ عذر کیوں پیش کریں ، جو باوجود صحیح ہونے کے ، دردِ دل کا مداوا نہیں ہو سکتا ۔

آپ یہاں سے دہلی تشریف لے گئیں اور مجھے کوئی اطلاع نہیں دی ، وہاں سے علیگڈھ آئیں اور مجھے بے خبر رکھا گیا ۔ پھر مراد آباد ، دیرہ دون ، اور خدا جانے کہاں کہاں پہونچیں ، اور مجھ کو کوئی علم نہیں ، یہاں تک کہ آپ کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی اور اب آپ کو ہوش آیا کہ کوئی " نامرادانہ زیست کرنے والا " لکھنؤ میں بھی رہتا ہے ! ۔

میں نے عرض کیا کہ " ذرا تفصیل سے کام لیجئے " آپ نے اس کے جواب میں صرف ایک " آہ سرد " سے کام لیا ، اور خاموش ہو رہیں ۔ یوں تو بظاہر اس تمام داستان میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو دُنیا کے لئے عجیب و غریب ہوتی ، لیکن میرے لئے ——— اب کیا بتاؤں ، یہ کیا تھا

ہزار دھیان کو ٹالا خیال آ ہی گیا

آپ کو شاید یاد نہ ہو گا ، لیکن میں وہ ساعت کبھی نہیں بھول سکتا ، جب آپ میرے سامنے نگاہ جھکائے ایک پھول

سے کھیل رہی تھیں، اور میں خوش تھا کہ — آج میں نے اپنا دل — "خون کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا" پھر کیا ہوا — اس کا مجھے بھی ہوش نہیں۔

بہر حال، اب کہ شوق و اجتناب کی تمام منزلیں ختم ہو کر ہم آپ دونوں پھر اجنبی ہو چکے ہیں — زخموں کو تازہ کرنا مناسب نہیں۔

یہ سب درست کہ تم بت بھی ہو خدا بھی ہو !
مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو !!

میں ۳ ر اور ۴ ر فروری کو رام پور میں تھا — آپ کا خط واپسی پر ملا — پہلے مل جاتا تو شاید آپ سے قریب تر ہونے کا احساس مجھے حاضری پر مجبور کر دیتا — لیکن اب ممکن نہیں — خدا حافظ

بنا چلا راکھ کا ڈھیر میں، بجھا چلا دل کو لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ لے کارواں رہیگی

(۲۵)

جذبۂ بیتاب —— کیا بتاؤں، کس عالم میں ہوں، سادگی و نسیاں کی حد ہو گئی:۔

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کس قدر جی چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ کہہ دوں جو آپ پوچھتی ہیں، لیکن ڈرتا ہوں کہ مبادا زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے، جسے آپ سننا تو چاہتی ہیں، لیکن کہنے کی اجازت نہیں دے سکتیں۔

"لیلی اخیلیہ" عرب کی مشہور شاعرہ تھی — اور خوبصورت بھی بہت تھی — ایک شاعر کو اس سے محبت ہو گئی۔ لیکن چونکہ عرب میں اسی سے شادی نہیں ہو سکتی تھی — جس سے محبت ہو جائے — اس لئے وہ دیوانہ وار مارا مارا پھرتا اور اپنا بیانِ مہجوری اشعار کے ذریعہ سے اس تک پہونچاتا رہتا — ایک بار اس نے چند اشعار لکھ کر اپنی محبوبہ کے پاس بھیجے جن کا مفہوم یہ تھا کہ "تم سے ازدواج ممکن نہیں، لیکن وصل بہر حال ممکن ہے: پھر ایک ممکن بات کو چھوڑ کر ناممکن بات کی کوشش کیوں کی جائے"۔

اس نے جواب دیا:۔ "افسوس ہے کہ تمہاری آرزو جو مجھے واقعی بہت عزیز ہے، کبھی پوری نہیں کر سکتی!"

اس وقت یہ واقعہ مجھے کیوں یاد آ گیا — ٹھہر جائیے —— "ذرا ہوش میں آلوں تو کہوں!"

(۲۶)

عرضِ شکوہ —— آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کوئی روشن ستارہ ٹوٹ کر غائب ہو جاتا ہے، تو آنکھوں کے سامنے تھوڑی دیر کے لئے عجیب قسم کا اندھیرا چھا جاتا ہے — بالکل یہی حالت آپ کی "پرسشِ گاہ گاہ" سے بھی ہوتی ہے — جس وقت آپ کا خط آتا ہے تو ساری دنیا مجھے روشن نظر آنے لگتی ہے — اور جب آپ سکوت اختیار کر لیتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات میں اندھیرے کے سوا کچھ نہیں — آج کل میں اسی احساس سے گزر رہا ہوں، اور سوا تاریکی کے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔

اب چھ مہینے قبل آپ نے مسلسل اپنے خطوں سے مجھ پر "بارشِ لطف و کرم" شروع کی، تو میں اس کی لذت میں اتنا کھو گیا کہ "خشک سالی" کا خیال تک ذہن میں نہ آتا تھا، لیکن جب اس کے بعد دفعتاً آپ نے خاموشی اختیار کی تو میں چونکا اور سمجھا کہ:۔

موجِ آبِ زندگی، برقِ سرابے بیش نیست

یعنی "سراب" نہیں، بلکہ صرف "جلوۂ سراب" اور وہ بھی اتنا گریز پا کہ اسے "برق سراب" سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے!۔

میں اس دوران میں رامپور گیا، تو معلوم ہوا کہ آپ بمبئی میں ہیں، خیال کیا کہ بمبئی پہونچوں، لیکن ڈرا کہ وہاں پہونچکر کہیں یہ نہ معلوم ہو کہ آپ بمبئی سے مکہ چلی گئیں۔ پھر میں کیا کروں گا، کیونکہ آپ اگر وہاں ہوں گی تو "کبوترِ بام حرم" ہوں گی، اور مجھے اپنے "رشتہ بر پا" ہونے کا حال معلوم ہے!

آج کل آپ کہاں ہیں، کچھ خبر نہیں، اس لئے رام پور ہی کے پتہ سے خط لکھ رہا ہوں، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا، کہ کبھی کبھی آپ کے ہاتھ کی تحریر نگاہ سے گزرتی رہے، اس سے کچھ اور فایدہ ہو یا نہ ہو، لیکن یہ کیا کم ہے کہ:۔

دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی!

(۲۷)

شکریۂ دلبری ـــــ محترمہ، نوازش نامہ کا شکریہ! لیکن پرسشِ حال کے جواب میں سوا اس کے کیا عرض کر سکتا ہوں کہ:۔

حال می پرسی و مارا گفتگو ہا کم شدست!
بسکہ برہم خوردہ دلہا آرزو ہا کم شدست!

آرزوؤں کا کم ہو جانا بُرا نہیں، لیکن اس کمی کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں، ایک وہ جو آپ کو حاصل ہے یعنی جو آرزو پیدا ہو وہ پوری ہو کر رہے، اور دوسری وہ جو میری مقسوم ہے، یعنی ہر آرزو کا اپنے ساتھ ناکامی کے اسباب لے کر پیدا ہونا۔ ظاہر ہے کہ آرزوؤں میں کمی اس طرح بھی ہوگی، لیکن ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

غالب نے ایک جگہ اس کیفیت کو یوں ظاہر کیا ہے:۔

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ!
تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی!!

لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ فراغ و سکون بھی "زہر خند" کی نوعیت کا ہوا کرتا ہے، ایک مایوس و غیور انسان اس کی تاویل کبھی یوں بھی کر لیتا ہے کہ:۔

مارا ہنوز عربدہ با خویشتن بسے ست

مگر دل چیر کر دیکھئے تو پتہ چلے کہ:۔

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن!

آپ کہیں گی یہ کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا، لیکن کیا کروں، آپ کے علاوہ کوئی اور سننے کا اہل بھی تو نہیں، بے شک مارچ کے بعد مجھے حاضری کا موقعہ نہ مل سکا، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ہی نے کب یاد کیا۔

۲۸

آدابِ محبت ـــــ اے تو مجموعۂ خوبی، بچہ نامت خوانم!۔ آپ کہیں گی اسکی کیا ضرورت ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تو کہئے:۔

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشہ بما رسد

انسان فطرتاً بت پرست ہے، اور بت پرستی نام ہے صرف اپنے جذبات کی رعایت کا، لیکن اس کا یقین کیجئے کہ اس باب میں میرا مسلک "گوسالہ پرستی" نہیں بلکہ "خورشید پرستی" ہے اس لئے باوجود اپنی تمام نارسائیوں کے بھی حفظ مراتب ہاتھ سے نہ دوں گا!

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری ست

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا "دامن بچا کے گزر جانا" کسی اور کے لئے گریباں چاک کر دینے کی بات ہو، یا سینہ شق ہو جانیکی لیکن میرے لئے وہ یکسر لطف و کرم تھا۔ سوال جان سلامت لے آنے کا نہیں۔ بلکہ "دیدن ہماں و جاں دادن ہماں" کا تھا۔ اب کہ آپ میرے خیال کی دسترس سے بھی باہر ہیں۔ زیادہ خوش ہوں، بشرطِ آنکہ آپ بھی اس سے خوش ہوں۔ ہاں اس دوران میں ایک صورت کبھی آنے کی پیدا ہوئی تھی، لیکن شکر ہے کہ وہ مٹ گئی، ورنہ وہاں جانا اور آپ سے نہ ملنا! بڑی سخت بات تھی —— ہرزہ سرائی معاف!

(۲۹)

شکریۂ عیادت —— قربان جائیے! - آپ نے بھی کس ادا سے مزاج پرسی کی ہے، یعنی بیمار نہ بھی ہوں تو اب ہو جاؤں!

خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم!

یہ آپ سے کس نے کہدیا کہ میں علیل ہوں —— اور علیل بھی ایسا کہ آپ فرطِ مسرت سے بیمار پرسی پر آمادہ ہوگئیں! کاشکے یہ لطف و عنایت آپ کبھی صحت و توانائی کے زمانہ میں صرف فرماتیں۔ بہر حال اس توجہ کا شکر گزار ہوں —— اور آپ کی عافیت اور اپنی علالت کا طلبگار!

(۳۰)

عذر و تقاضہ —— محترمہ! - پرسشِ حال کا شکریہ، لیکن سوچ رہا ہوں جواب میں کیا لکھوں، لیکن خیر، مومن کا یہ شعر تو سن ہی لیجئے:-

بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں   تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

ایک ہفتہ ادھر کی بات ہے کہ ایک محفل میں آپ کا ذکر چل پڑا۔ جتنے منھ اتنی باتیں، میں خاموش، لیکن آخر کب تک؟ مجبوراً بولنا پڑا۔ لیکن میں نے کیا کہا، شاید اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

میں اس کی خبر بھی آپ کو نہ کرتا، اگر میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جو آپ کی زبان سے بھی تصدیق چاہتی ہے۔ آپ کا ایک خط عرصہ ہوا مجھے ملا تھا۔ جس کی بنا پر میں نے وہ بات کہی تھی، لیکن وہ تحریر میرے پاس سے گم ہوگئی، ڈر رہا ہوں کہ اگر ثبوت طلب کیا گیا تو میں کیا کہوں گا، اس لئے پھر وہی دلخراش خبر سنا دیجئے، جو پہلے سنائی تھی، گو دل کو بار بار سنانا کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں! لیکن بات تو رہ جائے گی، غالباً آپ سمجھ گئی ہوں گی —— اور، ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ کیسا ہوں، اچھا یہ بھی سن لیجئے!

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں مرنے کی پر ملال تو ہے

(۳۱)

عرضِ گرانجانی ـــــ آپ کا خط ملا، حیرت ہے کہ آپ زمانہ کی شکایت کرتی ہیں، حالانکہ اگر زمانہ سے دریافت کیا جائے تو شاید وہ یہ کہے کہ :-

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

آپ ہی بتائیے یہ معمہ کیونکر حل ہو۔ میں نے ہمیشہ دلگرفتی کے ساتھ محسوس کیا کہ آپ کی عقل میں وقت سے بہت پہلے پختگی پیدا ہو گئی ـــــ کسی دوسرے کا حال تو معلوم نہیں، لیکن آپ کی اس نگہِ ہوشیار نے کم از کم مجھے تو ہمیشہ زچ ہی رکھا، کھُل کر بات نہ کر سکنا کیا کم کوفت ہے !

ایک زمانہ تھا جب عورت کی "سادگی و پرکاری" کا ذکر بہت حیرت سے کیا جاتا تھا، لیکن اب کہ اس کی سادگی ختم ہو کر وہ صرف پرکار ہو کر رہ گئی ہے، جتنا ماتم بھی کیا جائے کم ہے !

میں محترمہ لکھتا ہوں تو آپ کو ناگوار ہوتا ہے، کیونکہ آپ میرے سامنے کی بچّی ہیں، لیکن میں آپ کے سِن و سال کو نہیں دیکھتا بلکہ اس "بلوغِ کمال" کو دیکھتا ہوں، جس کے سامنے "سر بسجود" ہونے کی جگہ "زانوئے ادب" تہ کرنے ہی کو جی چاہتا ہے جہاں محبت کی گنجایش نہ ہو وہاں کم از کم عزت و احترام کو بار تو پانے دیجئے !

سیاست میں آپ میری رہنما، مذہب میں آپ میری پیر و مرشد، ادب و انشاء میں آپ میری اتالیق، اور اس پر یہ مطالبہ کہ محترمہ نہ لکھوں ـــــ ! ـــــ پھر کیا لکھوں ؟

شریر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ　　تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

آپ کو مارچ کا باب الاستفسار پڑھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن آپ کے خطوط پڑھ کر مجھے اس سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ خدا و رسول کے انکار سے، خدا و رسول کا کچھ نہیں بگڑتا، لیکن "انکارِ محبت" تو کھلی ہوئی بربادی ہے ـــ آپ کو کیا خبر کہ "کج دار و مریز" کتنا سخت امتحان ہے !

جس طرح برسوں پہلے آپ میرے لئے ایک "معمہ و چیستاں" تھیں، اُسی طرح آج بھی ہیں ـــ آپ تو خیر، غنچہ سے گُل بنیں، اور پھر گُل سے گلزار، لیکن یہاں جو قسمتِ شبنم، اور وہ بھی خارِ بیاباں پر مقسوم ہو چکی تھی۔ ابھی تک قایم ہے :-

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب، کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گرانجانی کرے !

کہہ دیجئے، "ہمیشہ" رامپور میں کب تک قیام رہے گا، یہ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے آپ سے کام ہے ! کتاب غالباً پہونچ گئی ہو گی !

(۳۲)

ادائے برہمی ـــــ کتنی تکلیف ہے اس خیال سے کہ اب عرصہ تک آپ کو میری خبر نہ ہو سکے گی ! ـــــ خود ہی برہم ہونا، اور خود ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا، کیا قیامت ہے ! حیران ہوں کہ اس معذرت کے بوجھ کو کب تک لئے پھروں گا، کس کمبخت نے کہا تھا کہ میں آپ کی تحریر سے خفا ہوں، مگر اس کا کیا علاج کہ جب آپ خود خفا ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ دوسرے ہی کی خفگی کو

اس کا بہانہ بنایا کرتی ہیں!

میں نے بے شک فوراً جواب نہیں لکھا، لیکن آپ ہی نے کب لکھا تھا کہ بمبئی کی فضا میں گم ہونے کے لئے آپ پا بر کاب ہیں! بہرحال اب تو یہ تحریر صرف "نقشے کز ما یادگار ماند" کی حیثیت رکھتی ہے، معلوم نہیں نگاہ سے گزرے یا نہ گزرے، اور گزرے بھی تو کس وقت!

(۳۳)

اعترافِ شوخی ـــــ خط ملا، آپ کی چھیڑ کا جواب اتنی دور سے دینا ممکن نہیں، اور پاس آ کر کچھ کہنے کی ہمت آپ نے کبھی کی ہی نہیں اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ "شوخی و دلبری" آپ کا حصہ ہے، اور اس فن میں آپ کا جواب نہیں۔ آپ نے میری بات کا نہایت مجمل جواب دیا، میں نے عرض کیا "سمجھا نہیں" آپ نے "گوش ناشنوا" کا الزام دیا، اور اب جو میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں چاہئے "دونا ہو تو التفات" تو آپ ہنستی ہیں ـــــ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس مرتبہ سفر حیدر آباد کے سلسلہ میں میرے بمبئی پہونچنے کا امکان بہت قوی ہے اور اگر میں نے ذرا بھی ہمتِ پرواز سے کام لیا، تو "بام حرم" ہی پر نظر آؤں گا ـــــ اس لئے اگر آپ بدستور مجھے "رشتہ بر پا" رکھنا چاہتی ہیں تو "صفیرِ قفس" بھی کبھی کبھی سُن لیا کیجئے، ورنہ کیا فایدہ کہ وہ شخص جس نے اس وقت تک

جُز بخلوت گاہ اسرار تو نکشودہ نقاب

آپ کو "ساحلِ اپالو" کی کھلی فضا میں بے نقاب کرنے پر آمادہ ہو جائے!

نمی ترسی ز آہِ آتشینم!

(۳۴)

طنز و شوخی ـــــ آپ مجھ سے "کوئی تازہ واردات" پوچھتی ہیں! قیامت ہے! کیا اس سے سخت "واردات" کوئی اور ہو سکتی ہے:-

کز شوق مُردم و بہ تماشا نیامدی

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس وقت آپ لکھنؤ سے گزرتی ہوئی دہلی جا رہی تھیں، تو میں بسترِ مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ وہ تو کہئے کہ آپ ایسی "انسان کُش" ہستیوں کے جواب میں خدا نے کچھ "مسیحا نفس" ہستیاں بھی پیدا کر دی ہیں، ان میں سے ایک نے مجھے جلا لیا، ورنہ آپ تو اپنا کام کر ہی چکی تھیں۔

خیر، یہ تو سب مذاق تھا، لیکن تازہ ترین واردات یہ ہے کہ دلّی کی خدمت میرے سپرد ہو گئی ہے، اور میں وہاں کے ابدال سے چارج لینے کے لئے ۱۸ر جولائی کو دہلی آ رہا ہوں۔ داخلہ پرائیویٹ ہے، اس لئے نہ کوئی جلوس نکلے گا، نہ سلامی ہوگی آپ کو یہ سُنکر افسوس ہوگا، لیکن کیا کیا جائے، خدا کو یہی منظور تھا کہ آپ کی کافر سامانیوں کا جواب اسی طرح دیا جائے۔ اُسی دن حیدر آباد چلا جاؤں گا، اس لئے ممکن ہو تو اسٹیشن پر مل لیجئے!

(۳۵)

اعترافِ کمزوری ـــــ کیا عرض کروں، آپ نے کس وقت مجھے یاد کیا:-

کمند کوتہ و بازوئے سست و بام بلند

اور پھر لطف یہ کہ "نا امیدی" میرے لئے گناہ!

آپ کی ہمت افزائی (دلداری کا لفظ میں نے قصداً استعمال نہیں کیا کہ نہ میں اس کا مستحق، نہ آپ اس کی عادی) کا شکریہ ادا ہو سکے یا نہ ہو سکے، لیکن مجھے تو اس کی کوشش کرنا ہی ہے ۔ اور اگر آپ کی خوشی یہی ہے کہ میں کمزوری کا اعتراف کر ہی لوں، تو لیجئے، یہ دستاویزِ اعتراف حاضر ہے، اس سے زیادہ اگر کچھ اور منظور ہے تو وہ بھی فرما دیجئے ۔

کہ خیالت دہد آئینہ جاں راصیقل!

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ اگر آپ نے کبھی یہ الزام قایم کر دیا کہ آپ کے غم میں، میں مر کیوں نہ گیا تو پھر اعتراف و معذرت کی بھی گنجایش باقی نہ رہے گی!

(۳۶)

فریبِ مسلسل ——— کس قدر عجیب بات ہے کہ جب میں مایوس ہو کر "ترکِ وفا" پر آمادہ ہوتا ہوں، ٹھیک اُسی وقت پھر آپ کا خط آجاتا ہے، اور میں پھر فریب میں مبتلا ہو جاتا ہوں، میں پوچھتا ہوں کہ یہ کھیل آخر کب تک کھیلا جائے گا!

یا تو بیگانہ ہی رہئے، ہو جئے یا آشنا
یہ ادا کیا، آشنا گاہے، گہے نا آشنا

اس میں شک نہیں کہ جب کوئی خاص مدعا نہ ہو تو خط لکھنے کا سوال بڑا مشکل ہو جاتا ہے ۔ یعنی یہ کہ لکھئے کیا؟ ———
"ذوقِ خامہ فرسا" اور "عشق نام لیلیٰ" کا زمانہ تو ہے نہیں کہ چاہنے والا صرف اتنا کہ کر بھی سب کچھ کر سکتا تھا، کہ:-

"ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے"

اب اگر کوئی اس دورِ نکتہ چینی میں ایسا کہے تو اُسے "برائے نام عاشق" کہیں گے!

بہر حال یہ عذر آپ کا واقعی معقول ہے کہ صرف "خیریت" کا خط لکھنا ہی کیا، لیکن اگر یہی عذر میری طرف سے ہو تو آپ فو[را] کہہ دیں گی کہ "خیریت" آخر ہئی کیوں ۔ محبت کرنے والوں کی دُنیا میں یہ چیز پائی کب جاتی ہے ۔ جس کا ذکر کیا جائے، اس کے جواب میں کیا، افلاطون بھی نہیں دے سکتا جس کی Platonic love کا ذکر آپ نے بھی سنا ہوگا، اس لئے کیا کرو[ں] مجبور ہوں، اور پھر عہدِ وفا استوار کئے لیتا ہوں ۔ "فکرِ تعمیر نہیں، ماتمِ تخریب سہی!"

شعروادب

اور

نقد وتبصرہ

(۱)

مشورۂ ترکِ غزل ــــ مکرمی! ــــ آپ کی غزل دیکھی ــــ آپ کو معلوم نہیں، میں مقالاً عرصہ ہوا اپنے آپ کو بیگانۂ "سخن" بنا چکا ہوں اور اسی لئے فکرو احساس کے لحاظ سے میری رائے اس باب میں بہت سخت ہوتی ہے۔ بہ تعمیل ارشاد غزل دیکھ لینے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن اگر "دیکھنا" اصلاح و مشورے کے مفہوم میں آپ نے استعمال کیا ہے تو میری معذرت قبول فرمائیے کیونکہ استاد بننے کا نہ مجھ میں سلیقہ، نہ اہلیت، میری زندگی خود یکسر متعلمانہ ہے اور ہر وقت استاد و رہبر کی آرزو مند، البتہ ایک مشورہ آپ کو ضرور دوں گا اور وہ یہ کہ آپ اس مشغلہ کو ترک کر دیں، تو بہتر ہے، کیونکہ آپ میں غزل گوئی کی اہلیت بہت کم پاتا ہوں۔ ممکن ہے مشق و مطالعہ کے بعد آپ نظمیں اچھی کہنے لگیں لیکن غزل میں آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی عمر کیا ہے، کیا مشغلہ ہے، لیکن یہ فرض کر لینے کے بعد بھی کہ آپ نوجوان ہیں، فکر معاش سے آزاد ہیں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ غزل کی طرف کیوں مائل ہیں ــ کہنے کی بات نہیں، لیکن کہنا پڑتی ہے کہ پہلے کہیں دل لگائیے، پھر واردات قلب لکھئے، محض وصل و ہجر کی سنی سنائی باتیں لکھ دینا غزل نہیں ہے ــــ "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد" کے اصول کو ہمیشہ سامنے رکھئے۔ معاف فرمائیے اگر میری صاف گوئی سے آپ کو تکلیف پہونچی ہو۔

(۲)

اصول افسانہ نگاری ــــ محترم! ــــ آپ کا افسانہ یعنی آپ کا لکھا ہوا ــــ نظر سے گزر چکا ہے لیکن دل و دماغ سے نہیں ــــ بُرا نہ مانیے تو عرض کروں کہ اس نے دل و دماغ کو اپنی طرف متوجہ کیا ہی نہیں ــــ الفاظ پاکیزہ ہیں، زبان صاف ہے، خیالات اچھے ہیں، موضوع پسندیدہ اور نتیجہ برمحل ہے لیکن پھر بھی جب یہ غور کرتا ہوں کہ یہ فسانہ کیوں کر ہوا تو حیران رہ جاتا ہوں ــــ میں آپ کو بتاؤں کہ فسانے کے ضروری اجزا کیا ہیں ایک ـ کسی واقعہ میں بحیثیت واقعہ ہونے کے "واقعیت" کا پایا جانا۔ دوسرے نفسیاتی طور پر کسی کے کردار یا سیرت کو نمایاں کرنا اسے انگریزی میں Characterisation کہتے ہیں، تیسرے پلاٹ کو اتنے اور ایسے اجزا میں تقسیم کرنا کہ پڑھنے والے کو ایک سے زائد خلا خود اپنے ذہن سے پُر کرنا پڑیں، چوتھے ہلکا سا مزاح، خواہ وہ محض الفاظ سے پیدا کیا جائے یا مفہوم سے ــــ اگر پلاٹ میں کوئی کیفیت رومان کی پیدا کر کے تھوڑا سا تمثیلی رنگ (Dramatic touch) دے دیا گیا تو اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ کسی ایک

مسئلہ پر مکالمہ میں صفحات کے صفحات رنگین کر دینا خلاف آئین فسانہ نگاری ہے ——— یہ درست ہے کہ بہترین فسانے وہی ہوتے ہیں جن میں ٹریجڈی کا عنصر غالب ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو ایک مستقل عذاب کی طرح سر پر نازل کر دیا جائے کہ ایک خاندان کی تباہی دکھانے پر آئے تو باپ کو ہیضے میں مبتلا کر کے فنا کر دیا، ماں کو طاعون سے ہلاک کرا دیا، بھائی کو سانپ سے ڈسوا دیا اور بہن کو کنوئیں میں ڈھکیل کر ختم کر دیا؟

آپ کا رجحان رومان کی طرف زیادہ ہے، سو بہتر ہے اس کو اختیار کیجئے، لیکن خدا کے لئے ہیرو اور ہیروئن کو اسی دُنیا کی مخلوق رہنے دیجئے، ملاء اعلیٰ کی اس آبادی سے جہاں گناہ و لغزش سے کوئی واقف ہی نہیں، اپنے فسانے کے افراد منتخب نہ کیجئے۔

(۳)

ترقی پسند شاعری ماشاء اللہ، کیا نظم لکھی ہے، کیا تیور ہیں، لیکن یہ تو بتائیے کہ اس سے لطف اُٹھانے کیلئے "وارنات" کو کہاں ڈھونڈھوں۔ ڈاکٹر اشرف الحق حیدر آبادی نے بھی "اعادۂ شباب" کا آپریشن شاید اب ترک کر دیا ہے۔

آپ کیوں نہ "کوک شاستر" کو نظم کر ڈالیں، کیا اس سے بہتر ترقی پسندانہ لٹریچر کوئی اور ہو سکتا ہے؟

بندہ نواز، عُریانی بُری چیز نہیں بشرطیکہ وہ "نیم عُریانی" سے آگے نہ بڑھے۔ بدن چُرا کر چلے جانے میں، سینہ تان کر سامنے آجانے سے شاید زیادہ لطف ہے۔

کنایہ و استعارہ وغیرہ کو چھوڑئے، شاعرانہ ڈھکوسلے سہی، لیکن انسان کے نفسیاتی رجحان کو آپ کیونکر بدل سکتے ہیں، آرٹ کا کمال یہ نہیں کہ وہ اپنے سامنے دیوار حایل کر دے، وہ بالکل بے کار چیز ہے، اگر دوسروں کو اس تک پہونچنے کی رغبت نہ ہو، لباس تار تار ہو جانے کے بعد لباس نہیں رہتا، موسیقی نام سُر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا نہیں، بلکہ سروں کو ہم آہنگ کر دینے کا ہے۔ آپ کی شاعری ایسی "جراحی" ہے جس کے زخم سے فاسد مادہ ہمیشہ رستا رہے گا اور سوا عفونت پھیلانے کے اس کا کوئی نتیجہ نہیں۔

دُنیا میں ہر چیز کی ایک تہذیب ہوتی ہے، اور شاعری کی بھی ایک تہذیب ہے۔ آپ نہ مانیں یہ اور بات ہے، لیکن جب تک ساری دنیا غیر مہذب نہ ہو جائے آپ کو رنج ناکامی اُٹھانا ہی پڑے گا۔

(۴)

کلام مومن ——— رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

آپ نے بھی کس کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں تو اس وقت تک اس لئے خاموش تھا کہ دُنیا کا ذوق اتنا بلند ہی نہیں ہوا کہ وہ مومن کو سمجھ سکے۔ ایسے ایسے خدا جانے کتنے جواہر پارے اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں، خلاصہ یہ کہ مومن کنایہ و طنزیات کا بادشاہ تھا اور اس وقت تک دنیائے شاعری اس کا جواب پیدا نہ کر سکی ——— ایک اسی شعر کو لیجئے جو آپ نے لکھا ہے، خدا جانے کتنے ٹکڑے ملانے کے بعد یہ داستان پوری ہو سکتی ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ تمام ٹکڑے خود شعر ہی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ پہلے "رشکِ دشمن بہانہ تھا" کس نے کہا؟ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ محبوب نے کہا ہوگا اور مومن سے کہا ہوگا ——— (متعبر کیجئے)

اس لئے یہ بات کھل گئی کہ مومن نے اپنی عدم حاضری کا سبب کبھی یہ بتایا ہوگا کہ میرے آنے سے دشمن کو رشک پیدا ہوتا ہے اور یہ غالباً آپ کو گوارا نہ ہوگا ــــ محبوب نے یہ سن کر کہا ہوگا کہ :- "کیوں رشکِ دشمن کا بہانہ کرتے ہو، یہ کیوں نہیں کہتے کہ محبت اب نبھ نہیں سکتی" ــــ اس کا جواب مومن نے اپنے اسی طنزیہ انداز میں یوں دیا کہ :-

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

یعنی اگر تم یہ کہتے ہو تو یہی سہی ــــ مدعا یہ کہ تمہارا الزام بالکل غلط ہے اور مجھ سے بے وفائی کی شکایت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اگر آپ نے کوئی اور مفہوم پیدا کیا ہے تو اس سے مطلع کیجئے۔ آپ اس رنگ کے اور شعر چاہتے ہیں، مومن کا دیوان بھرا پڑا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا — مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں
کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں — سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا
کیا گلے ہوتے جو اور وں پہ بھی رحم آجاتا — شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا
عدو اس اوج پر شاکی ہے غصہ شاید آجائے — ملا دے خاک میں یہ بھی تو شکر آسماں کیجئے
خود بینی و بیخودی میں ہے فرق — میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

یاد رکھئے کہ دیوان غالب کی شرحیں لکھی جائیں گی، ذوق و سودا کے قصائد حل کر لئے جائیں گے، لیکن مومن کو چھونے کی ہمت کسی میں نہیں، دیکھئے اگر کبھی فرصت ہوئی تو میں ہی اس خدمت کو انجام دوں گا۔ سچ ہے،

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق

اگر آپ آمادہ ہو جائیں تو کیا کہنا!

(۵)

داغ و امیر ــــ صدر نقی العزیز ــــ مکتوب گرامی ملا، لیکن شکریہ اس لئے ادا نہیں کرتا کہ اس میں نہ میرے کام کی بات تھی نہ آپ کے۔ جس حد تک وہاں کی فضا کا تعلق ہے آپ کی غزل میں کسی ایک حرف کے اضافہ کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ غزل کیا نظم بھی نہیں ہے، نثر بھی نہیں ہے، یاد رکھئے جب تک آپ تقلید و اتباع ترک کر کے خود اپنے اندر کوئی کیفیت شعر کہنے کی نہ پیدا کریں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

آپ نے امیر و داغ کی بحث چھیڑ کر طبیعت کو مکدر کر دیا۔ جس حد تک مراۃ الغیب کا تعلق ہے امیر و داغ کے موازنہ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ دونوں میں شمال و جنوب کی نسبت ہے لیکن صنمخانۂ عشق لکھ کر امیر نے خواہ مخواہ ایک عذاب مول لے لیا، اپنے لئے بھی کہ اُن کے شایانِ شان نہ تھا اور دوسروں کے لئے بھی ان کو داغ کی سطح پر لا کر گفتگو کرنا پڑتی ہے۔

امیر شاعر تھے اس میں کلام نہیں، لیکن آپ کو معلوم نہیں شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں — وہبی و اکتسابی — میں نے یہ تقسیم اور طرح کی ہے مطلق شاعر اور شاعر بالقوۃ، یعنی ایک تو وہ جو سوا شعر کہنے کے اور کسی کام کا نہیں یعنی شعر نہ کہے گا تو مرے گا کیا اور دوسرا وہ جو دوسری تمام انسانی اہلیتوں کے ساتھ شعر گوئی کی بھی اہلیت رکھتا ہے، سو ظاہر ہے کہ جہاں تک محض شعر کا تعلق ہے امیر کو داغ سے کوئی نسبت نہیں، داغ صرف شاعر تھا اور کچھ نہیں، امیر سب کچھ تھے مگر شاعر نہیں — داغ کا سرمایۂ ہستی صرف اس کی شاعری تھی اور امیر کے لئے یہ امر باعث فخر و ناز نہ تھا — داغ نے تمام عمر اسی ماحول میں بسر کر دی، جو گوشت پوست سے متعلق ہونے والی شاعری کے لئے ضروری ہے اور غریب امیر کو نماز پنجگانہ اور تہجد گزاری سے کہاں فرصت تھی کہ وہ اس طرف توجہ کرتے۔

ہر چند مرأۃ الغیب (ان کے دیوان اول) کی شاعری بھی صرف امیر کی سی شاعری ہے جس میں جذبات وغیرہ سے بہت کم سروکار ہے، لیکن خیر ایک مخصوص رنگ اس زمانہ کا ہے جو اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ہے، لیکن صنمخانۂ عشق لکھ کر تو انھوں نے کمال ہی کر دیا۔ غضب خدا کا امیر ایسا شخص اور عامیانہ جذبات نگاری میں اس سطح تک اتر آئے کہ:-

رخسار نازک ہوں تو ہوں آج ایک مانوں گا نہ میں
دو بوسے لوں گا جانِ من ایک اس طرف ایک اس طرف

داغ سے تو ہم یہ سن سکتے ہیں کہ:-

مِسّی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

لیکن امیر ایسے سنجیدہ و متقی شخص کی طرف سے ہم ایسی بات گوارا نہیں کر سکتے

(۶)

رموز نقاشی —— مکرمی، تسلیم —— "نقوش" ملے اور پورا ایک دن ان کے مطالعہ میں صرف کیا، ظاہر ہے کہ جس چیز میں میں نے گھنٹوں تک لطف اٹھایا ہو اس کی تعریف چند سطروں میں کیا ہو سکتی ہے لیکن اس خیال سے کہ آپ جواب کے منتظر ہوں گے اولین فرصت میں یہ عریضہ بھیج رہا ہوں۔

(۱) "طلوع صبح" اچھا عنوان ہے، لیکن پامال، میری رائے میں "امتزاج رنگ و نور" زیادہ موزوں ہے — کیونکہ آپ کے نقش کو دیکھ کر مشکل سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے صبح کا منظر دکھایا ہے یا شام کا اور اسی لئے غالباً آپ نے عنوان میں اس کو ظاہر کر دیا ہے۔

آفتاب جس وقت تک بلند نہ ہو ایک نقش میں محض روشنی سے یہ پتہ چلانا کہ صبح کا وقت ہے یا شام کا مشکل ہے، علی الخصوص اس وقت جبکہ ماحول سے بھی کوئی سراغ نہ چل سکے۔ اگر آپ چڑیوں کی پرواز، درختوں کی سمت سے روشنی کی طرف دکھاتے تو طلوعِ صبح کا منظر زیادہ قریب الفہم ہو جاتا، اور روشنی کی طرف سے درختوں کی طرف ان کی آمد دکھاتے تو شام کا منظر متحقق ہو جاتا، لیکن آپ نے چونکہ اس چیز کو بالکل ترک کر دیا ہے اس لئے عنوان کو بھی مبہم ہی رہنے دیجئے تو اچھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ افق کے "غبار رنگین" کو جس تکمیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے وہ آپ کے مطالعۂ فطرت کا اچھا ثبوت ہے اور "پس منظر" میں جو آپ نے ایک شان "لانہایت" کی پیدا کر دی ہے وہ کسی معمولی نقاش کے فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

(۲) "نظارۂ سرِراہ" بہت دلکش نقش ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جس لڑکی کو آپ نے برہنہ پا دکھایا ہے، کیا اس کا لباس وہی ہونا چاہئیے جو آپ نے تجویز کیا ہے، میری رائے میں اس کو دہقانی لباس میں پیش کرنا چاہئیے تھا۔ ترچھی مانگ رکھنے والی اور ریشمی ساریاں پہننے والی لڑکیاں غالباً کبھی برہنہ پا نہیں دیکھی جاتیں۔

ایڑی سے چبھا ہوا کانٹا نکالنے کے لئے جتنے خم اور لوچ ایک کمسن لڑکی کے جسم میں پیدا ہونے چاہئیں وہ سب آپ نے حد درجہ تکمیل کے ساتھ دکھائے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ گردن اٹھا کر دیکھ کس کو رہی ہے —— آپ نے یہ پوزیشن صرف اس لئے رکھا ہے کہ اس کی صورت بھی سامنے آجائے لیکن اگر آپ چاہتے تو صرف ایک رُخ دکھا کر اس کے نقشے کے تناسب کو پیش کر سکتے تھے۔ اصولاً و فطرتاً اس کی نگاہ ایڑی ہی کی طرف رہنا چاہئیے تھی اور اس حالت میں جو خم اس کی گردن میں پیدا کیا جاتا وہ بہت زیادہ دلکش ہوتا، بحیثیت صاحب فن ہونے کے یہ نکتہ آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ ایک نقش میں ایک آدھ خلا ایسا چھوڑ دینا جنھیں دیکھنے والے کا دماغ خود پُر کرے بہت لطف کی بات ہے۔

(۳) گاؤں کی ایک شام —— میرے نزدیک آپ کا یہ نقش بہت کامیاب ہے اور شام کے وقت ایک گاؤں کا جو منظر ہونا چاہئیے اس کو آپ نے ہر ممکن تفصیل کے ساتھ دکھا دیا ہے۔ آبادی پر ہلکا سا تاریک سایہ اور درختوں کی چوٹیوں پر کہیں کہیں مضمحل دھوپ، مویشیوں کی تھکی ہوئی واپسی، تالاب کے پانی کا سکون، درختوں پر چڑیوں کا جھنڈ، الغرض تمام باتیں تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں —— اگر آپ ایک دو کا اٹھا ہوا سر دکھا دیتے تو خوب ہوتا، شام کو جب مویشی واپس آتے ہیں تو گائیں اس خوشی میں کہ اپنے بچوں کو دیکھیں گی، ضرور دو چار مرتبہ ہمک کر آواز دیتی ہیں۔

(۴) آئینہ کے سامنے —— اچھی تصویر ہے لیکن اس میں بھی بہت عمومیت ہے اگر آپ آئینے کو تصویر میں نہ دکھاتے اور صرف لڑکی کے نقش سے یہ بات ظاہر کر دیتے کہ وہ آئینہ دیکھ رہی ہے تو یہ عمل بہت بلند ہو جاتا —— آئینہ تو سبھی دکھاتے ہیں، لطف تو جب تھا کہ بغیر اس کے دکھائے ہوئے لوگوں کے ذہن کو آپ اس طرف منتقل کر دیتے۔

(۷)

میرزا مظہر —— تمہارا خط ابھی ملا — یعنی ۱۰ ستمبر ٹھیک دس بجے دن کو، اور اسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گیا، باتیں مزہ کی تھیں، جی لگ گیا۔ خیر، بزرگی و رِندگی تو میں جانتا نہیں لیکن اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ میرزا مظہر اپنے ذوق کے لحاظ سے واقعی "جانِ جاناں" تھے۔

اگر تم نے ان کے کلام کا غائر مطالعہ کیا ہے تو اس کے ماننے میں تامل نہ ہونا چاہئیے کہ وہ نہایت رنگین و لطیف طبیعت رکھتے تھے اور ذوقِ شعر کے لحاظ سے تو فارسی اُردو دونوں میں ان کا جواب نہ تھا۔

رہ گیا سوال "تاباں" کا سو تذکرہ نویس کچھ نہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اُن سے شدید محبت کرتے تھے، "تاباں" کے غیر معمولی جمیل ہونے پر سب کو اتفاق ہے، رہ گئے مرزا صاحب سو، ان کا یہ ذوق خود ان کے کلام سے ظاہر ہے، ہر چند امرد پرستی کا اظہار فارسی شاعری میں ایسی معمولی بات ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر کسی شاعر کے امرد پرست ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن میرزا صاحب کے یہاں یہ رنگ کچھ عجیب و غریب کیفیت لئے ہوئے ہے۔

اس قسم کے اشعار کم و بیش تمام شاعروں کے یہاں پائے جاتے ہیں لیکن میرزا صاحب جس تکرار و لذت کے ساتھ

9293

اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں وہ دوسروں کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے، چند شعر سناتا ہوں :-

دگر چگونہ تواں کرد یادِ حق مظہر
الٰہا طلِ من عشق نوجوانے ہست

تم کہوگے کہ "نوجوان" مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی، بہتر ہے ایک شعر اور سنو :-

کنوں در جائے سرِ تیغ مرصع سنگہا دارد
بہ طفلاں مظہر ما بس کہ الفت بیشتر دارد

ممکن ہے تم یہ کہو کہ طفل چھوٹے بچے کو کہتے ہیں اور اس سے امرد پرستی کو کوئی تعلق نہیں، لیکن خود میرزا صاحب نے طفل کے کیا معنی لئے ہیں یہ بھی سن لو :-

عشق بازاں مرید طفلاں اند
پیرِ ایں قوم نوجواں باشد

طفل سے مراد ان کی نوجوان ہے یا نہیں ؟- اب کیوں نہیں بولتے ؟ اچھا اور لو :-

عاقبت از بہر تحصیل کمال جذبِ عشق — شد مرید نوجوانے گرچہ مظہر پیر مرد
پیر پس باعثِ ضعف قوائے مظہر ما — کہ گشتہ پیر ز بیدادِ نوجوانے چند
مظہر تو دشمنِ خودی لے خانماں خراب — دل می دہد بدست سپاہی پسر کسے
خویش و مظہر بدستِ دلبرے بفروختم — بہر بیعت پیر می جستم جوانے یافتم

بعض اشعار میں تو انھوں نے اشارہ تک کر دیا ہے مثلاً :-

من از رنگیں ادائیہائے اشعارش گماں دارم
کہ مظہر میل با رعنا جوانے میرزا دارد

اور ایک جگہ تو اس سے بھی زیادہ کھل گئے ہیں :-

کفر و دیں امروز مظہر نازہا دارد بہ من
سرو رعنا ساخت عشق میرزا راجا مرا

اس کی تحقیق شاید تم نے کی ہوگی کہ وہ حیدر آباد گئے یا نہیں لیکن دکن کے سانولے سلونے لڑکوں سے انھوں نے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے اس شعر سے عیاں ہے :-

گشتہ ام محو سوادِ سبز خطان دکن
دلنشیں افتاد نقش حیدر آبادی مرا

یہ تو وہ اشعار ہیں جن میں کسی تاویل کی ضرورت ہی نہیں ورنہ یوں تو جھلک نہ معلوم کتنے اشعار سے نمایاں ہے۔ ایک شعر سنو کس قیامت کا لکھ گئے ہیں :-

سر از تیغ بر دن آساں نیست
آہ از منظہر خم سلام کسے

میں تو مظہر کے ذوقِ شاعری کا پرستار ہوں اور اس سے بحث نہیں کہ وہ امرد پرست تھے یا کیا کیونکہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا گناہ ہے۔ شاید تم اس راز سے آگاہ نہیں کہ "حسنِ مجرد" کے پرستاروں کا میلان اس طرف زیادہ ہوتا ہے گو خود میرا مشرب یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ محبت کے باب میں روحانیت و حقانیت میری سمجھ میں آتی نہیں اور کسی صوفی کی خدمت میں بیٹھ کر یہ فن سیکھنے کی کوشش کبھی کی نہیں، میں محبت کرتا ہوں اور گناہ سمجھ کر کرتا ہوں تاکہ اس کی لذت باقی رہے، عورت کے ساتھ جانماز کا سا شرعی تعلق میرے بس کی بات نہیں۔

(۸)

غالب و میرزا مظہر ——— عزیز مکرم! ——— اس میں شک نہیں کہ غالب کا جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ نہایت پاکیزہ ہے اور جذبۂ رشک کا اظہار جس انداز سے کیا گیا ہے وہ گوناگوں کیفیات اپنے اندر لئے ہوئے ہے، لیکن یہ کہنا کہ غالب اس خیال میں بالکل منفرد نظر آتا ہے غالباً درست نہیں۔

غالب[۱] کے شعر میں دو ٹکڑے نہایت پاکیزہ ہیں پہلے مصرعہ میں "دیکھنا قسمت" اور دوسرے مصرعہ میں "کب مجھ سے دیکھا جائے ہے" اس میں زیادہ لطیف شاعرانہ خوبی اس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ "دیکھنا" دو علحدہ علحدہ معنوں میں استعمال ہوا ہے، ایک جگہ "نظر کرنے" کے مفہوم میں اور دوسری جگہ "گوارا کرنے" کے معنی میں۔ اس وقت فارسی کا ایک شعر یاد آگیا، اسے بھی سن لو:-

در محبت بیشتر جانِ مرا از رشک سوخت
آں کہ بر رویش نظر بسیار نتوانست کرد

اس کے دوسرے مصرعہ میں جو کیفیت ہے اس کا غالب کے شعر میں کہیں پتہ نہیں یہ شعر میرزا مظہر کا ہے جو غالب سے بہت متقدم العہد تھے، غالب کے سامنے یہ شعر تھا یا نہیں، اس کا علم کسے؟ لیکن دونوں کا فرق کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں۔

شعر کے محاسن، جن کا تعلق صرف وجدان سے ہے، کبھی بیان میں نہیں آسکتے، لیکن جانتا ہوں کہ تم مانو گے نہیں اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

غالب کہتا ہے کہ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ محبوب کو دیکھنے کے بعد خود مجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے اور اس لئے میں اسے اب دیکھ بھی نہیں سکتا۔

مرزا مظہر نے پہلے مصرعہ میں لفظ بیشتر کہکر دوسرے مصرعہ میں اس کو جس خوبی سے پھیلایا ہے وہ شاعرانہ بلاغت کی انتہا ہے۔

غالب کے یہاں تو معاملہ صرف اس حد تک پہونچ کر ختم ہو گیا کہ از راہ رشک وہ محبوب کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ مرزا مظہر ایک منزل اور آگے بڑھ گئے۔ یعنی باوجود اس رشک کے بھی ان کو اپنے دل پر قابو نہ تھا جسے لفظ بیشتر سے ظاہر کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے مرزا مظہر نے رشک کی تخصیص نہیں کی جس سے مفہوم زیادہ وسیع ہو گیا اور غالب کی سی تخصیص "انا ولا غیری" باقی نہیں رہی پھر دوسرے مصرعہ کا انداز بیان جس قیامت کا ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

---

[۱] غالب کا پورا شعر یہ ہے:-
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(۹)

غالب و مومن —— صدیقی! —— آپ نے جس عہد شاعری کا ذکر کیا ہے وہ اس میں شک نہیں انتہائی عروج کا دور تھا۔ لیکن اندازِ بیان کی خوبی کے لحاظ سے آپ سوا مومن اور غالب کے کسی اور کا ذکر نہ کیجئے۔ غالب اس باب میں زیادہ خوش قسمت تھا کہ اس کو شاگرد بھی اچھے اچھے مل گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت بھی غالب کا تتبع جاری ہے۔ مومن کے سلسلہ میں نسیم، تسلیم اور حسرت موہانی کا کیا کہنا لیکن مومن کا سا انداز بیان کسی کو نصیب نہ ہوا۔

معمولی سی بات کو طرزِ ادا کی خصوصیت سے دلچسپ بنا دینا، یہی ہے اصل شاعری اور اسی کو کہتے ہیں معنی آفرینی۔ ورنہ کوئی ایسی بات کہنا جو بالکل نئی ہو بہت دشوار ہے۔

دربانِ محبوب کو اکثر شعراء نے رضوان سے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور اس بیان میں حقیقتاً کوئی ندرت نہیں ہے لیکن غالب کو دیکھئے کہ محض انداز بیان سے کتنی تازگی پیدا کر دیتا ہے۔

بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے ‏ ‏ ‏ کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

کوچۂ دوست کو بہشت پر ترجیح دینا معمولی بات ہے، بہت سے شعراء نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ لیکن غالب کی انفرادیت اس باب میں ملاحظہ ہو۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت ‏ ‏ ‏ یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

اب مومن کو دیکھئے۔ آپ نے ہزاروں جگہ شاعروں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ "آشیاں" کی تباہی لازم ہے، خواہ وہ بجلی سے ہو یا صیاد کے ہاتھ سے بالکل یہی بات ہے۔ لیکن مومن نے ندرت بیان سے اُسے کتنا اچھوتا بنا دیا۔

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے ‏ ‏ ‏ صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

آئینہ دیکھ کر محبوب کا خود اپنے اوپر فریفتہ ہو جانا، نیا مضمون نہیں۔ اکثر آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا۔ لیکن مومن کے اسلوب ادا کو بھی دیکھئے۔

آئینہ جلدی سے پٹک دو کہیں ‏ ‏ ‏ دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا

رہا یہ امر کہ مومن و غالب میں بہ لحاظ اندازِ بیان کیا فرق ہے۔ اس کا فیصلہ بہت دشوار ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے اور بہت مشہور شعر ہے۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس مضمون کے لئے اس سے بہتر طرز ادا کوئی اور ہو سکتا ہے، لیکن مومن کے کمال کو دیکھئے لکھتا ہے۔

شبنم خراب، مہر کتاں سینہ چاک ماہ ‏ ‏ ‏ لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

میں تو دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ لیکن مومن کی شاعری کا ایک رنگ اور بھی ہے جس میں وہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ مثلاً:

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے ‏ ‏ ‏ تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

نارسائی سے دم رکے تو رکے | میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
اے ناصحو آہی گیا وہ فتنۂ ایام لو | ہمکو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دلکو تھام لو
جان نہ کھا، وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں | جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

غالب کے یہاں شوخی، مومن سے زیادہ ہے لیکن اس کا لطف حاصل کرنا ہو تو اس کا فارسی کلام دیکھو۔

(۱۰)

اُردو فارسی شاعری —— مکرمی! — اس میں شک نہیں کہ اُردو شاعری کے دامن میں بقول جناب بے شمار "جواہر رنگا رنگ" نظر آتے ہیں، لیکن یہ خیال تو کبھی میرے خواب میں بھی نہیں آیا کہ وہ فارسی شاعری کی ہم پلہ قرار دیجا سکتی ہے۔ معاف فرمائیے جس چیز کو آپ "جواہر رنگا رنگ" فرماتے ہیں وہ سب صدقہ ہے فارسی شاعری کا ورنہ اس سے قبل تو حقیقت یہ ہے کہ وہ :-

ایک چیز لچر سی' بزبانِ دکنی تھی،

یہ درست ہے کہ نزاکت خیال و معنی آفرینی کی اچھی اچھی مثالیں اُردو شاعری میں ملتی ہیں لیکن یہ سب وہی ہیں جن میں فارسی کا عنصر غالب ہے اور اس باب میں اُردو کی مجبوری ظاہر ہے کیونکہ اس کے حروف صلہ و روابط نے اس کی وسعت کو بہت کم کر دیا ہے اور وہی ایک خیال جسے ہم فارسی کے دو لفظوں میں ادا کر سکتے ہیں، اُردو کے چار لفظوں سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک بار میں اس خیال کو ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ "مجھ مجبور کے ہجوم آرزو کا حال تم کیا پوچھتے ہو، کیونکہ تمہاری، وہ نگاہ جو مجھ تک نہیں پہونچ سکی اسی کو میں نے اپنا مدعا قرار دے لیا" چونکہ اس وقت فارسی کی غزل پر فکر کر رہا تھا اس لئے شعر یوں ہو گیا :-

چہ پرسی از ہجوم آرزو ہائے من بیکس
سوئے من ہر نگاہت را کہ نامد مدعا کردم

اُردو میں اس خیال کو اس قدر اختصار کے ساتھ ظاہر کرنا دشوار ہے اور اس کا بڑا سبب وہی ہے جو ابھی عرض کیا کہ اس میں "سے، کا، کی" وغیرہ بہت جگہ لے لیتے ہیں اور فارسی میں صرف زیر زبر سے کام نکل جاتا ہے۔ غالب کا شعر ہے :-

شبم تاریک و منزل دور نقشِ جادہ ناپیدا
ہلاکم جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاہی را

دوسرے مصرعہ کے چند الفاظ جتنے وسیع مفہوم پر حاوی ہیں وہ اُردو کے پورے شعر سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتا۔

دوسری چیز جو فارسی شاعری کو اُردو سے ممیز کرتی ہے اس کے انداز بیان کا تیکھا پن ہے جو ایرانی کلچر کی رنگینیوں اور اس کے بڑھے ہوئے تکلفات سے پیدا ہوا ہے۔

عرفی کا ایک شعر ہے :-

خوش آنکہ پیش تو پرسند حالِ عرفی داد
شکایتے بہ کنایت ز روزگار کشد

کسی قوم کی زبان میں طنزیہ لٹریچر اسی وقت بڑھتا ہے جب وہ تمدن کی انتہائی منزلیں طے کر چکی ہو اور معیشت و معاشرت کی لطافت و نزاکت نے اس کی ہر ہر چیز کو مخصوص اصول و عواید کا پابند بنا کر خاص قسم کی پرتکلف شایستگی اس میں پیدا کر دی ہو۔ اب عرفی کے اس شعر کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس سے کتنا لطیف کچھ ظاہر ہوتا ہے اور شکوہ و شکایت کرنے کے لئے جو اہتمام عرفی کے پیش نظر ہے وہ "تہذیب" کے کتنے گہرے نقوش اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ ایرانی شاعر کسی حال میں ہو لیکن "بزم آرائی" اور "باغ و راغ" کے خیال سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ تشبیہ و استعارہ تو خیر بالکل سامنے کی چیز ہیں لیکن وہ اپنے غم آلود جذبات کے اظہار میں بھی "گل و گلستاں" اور "شمع و شبستاں" کے دائرہ سے باہر جانا پسند نہیں کرتا وہ اپنی پریشان حالی کا اظہار کرتا ہے تو بھی اس کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ :-

آشفتگی کجا و ہوائے چمن کجا

اور اپنی دل کی آگ کا ذکر کرتا ہے تو بھی انداز بیان یہ ہوتا ہے :-

آتش زدی چمن چمن افروختی مرا

دشت نوردی و آبلہ پائی کا منظر ایسا نہیں کہ اس میں کوئی رنگین بیانی کام دے سکے لیکن وہ یہاں بھی اپنی اس وضع پر قایم رہتا ہے اور اس سے فایدہ اٹھانے کی صورت یہ پیدا کرتا ہے :-

میزنم بر سر گلے تا خارے از پا می کشم

جلال اسیر نے ایک جگہ شمع و پروانہ اور گل و بلبل کا اجتماع جس خوبی و اہتمام سے کیا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے :-

شمع را ہمدرد بلبل کرد عشق
برگ گل چیدہ و بر پروانہ ساخت

گویا پھولوں کی سیج ہے۔

الغرض ایرانی عاشق اگر محبت بھی کرتا ہے تو اس فلسفہ کے ساتھ کہ :

در کارِ عشق نالہ و آہے ضرور نیست

اور صحرا نوردی پر مجبور ہوتا ہے تو اس شان کے ساتھ کہ :-

ہر سایۂ خارے شکن طرف کلاہے ست

میں سلسلۂ گفتگو میں معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ہاں تو مقصود یہ کہنا تھا کہ فارسی کے انداز بیان میں جو طرحداری پائی جاتی ہے وہ اردو کو نصیب نہیں البتہ مومن و غالب کے یہاں اس بانکپن کی مثالیں ملتی ہیں لیکن ان میں بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے جو فارسی سے میسر کر سکے۔ پھر اس کا سبب وہی ہے جو ابھی بیان کر چکا کہ فارسی زبان میں جو وسعت ہے وہ اردو کو میسر نہیں، اور اسی لئے غالب کا ذوقِ شعری فارسی میں جا کر پورا ہوا اور اپنے اردو کلام کو "مجموعۂ بے رنگ" کہکر اسے معذرت کرنا پڑی۔

میں فارسی اندازِ بیان کی چند مثالیں یہاں پیش کرتا ہوں۔ اگر ان سے ہٹ کر کوئی اور راہ اردو نے شوخ نگاری کی پیدا کی ہو تو میں بھی سننا چاہتا ہوں۔

[library stamp]

قمریاں پاس غلط کردۂ خود می دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

شوخ نگاری سے میری مراد بیان کا وہ مخصوص انداز ہے جو معمولی سی بات میں ندرت پیدا کردے۔ شاعر کہنا صرف یہ چاہتا ہے کہ میرا محبوب خوش قامتی میں سرو سے بہتر ہے، لیکن لطافت بیان دیکھئے۔

اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

ساقی تو ئی و سادہ دلی ہیں کہ شیخ شہر
باور نمی کند کہ ملک میگسار شد!!

ہندوستان کے فارسی شعراء میں غالب اس رنگ کا تنہا مالک تھا چند شعر اس کے بھی سن لیجئے:۔

خجلت نگر کہ در حسنا تم نیافتند
جز روزۂ درست زصہبا کشودہٗ

لفظ خجلت اور درست نے اس شعر کے انداز بیان کو اعجاز کی حد تک پہونچا دیا ہے۔

من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا
فریبمش کہ مگر می تواں فریفت مرا

یہ تو چند مثالیں صرف انداز بیان کی ندرت کی ہیں۔ معنی آفرینی اور حسن تعبیر کا ذکر کروں تو مہینوں یہ داستان ختم نہ ہو غالب کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ آشیاں کے جلنے کے ہزاروں شعر آپ نے دیکھے ہوں گے، لیکن ذرا اس کو بھی دیکھئے کہتا ہے:۔

مراد میدن گل در گماں فگند امروز
کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت

معاف فرمائیے میں نے آپ کا بہت وقت ضایع کیا لیکن کیا کروں اس وقت کہ فارسی کا ذوق بالکل مفقود ہوتا جارہا ہے کسی طرف سے کوئی آواز ایسی آجاتی ہے تو دل بے چین ہوجاتا ہے اور بہت سی وہ باتیں جو زبان تک اس لئے نہیں آتیں کہ ان کا سننے والا اب کون ہے بے اختیارانہ منھ سے نکل ہی جاتی ہیں، خوش رہئے کہ آپ نے یہ ذکر چھیڑ کر دل کا بوجھ کچھ تھوڑا سا ہلکا کردیا، لیکن اسی کے ساتھ آخر میں دبی زبان مجھے یہ بھی کہنے دیجئے کہ فارسی شاعری کا دلدادہ میں اس کی شوخ نگاری یا معنی آفرینی کے لحاظ سے نہیں ہوں بلکہ صرف اس لئے کہ وہی جلال آسیر جو یاروں کی صحبت میں اپنے محبوب کا ذکر اس رنگیں بیانی سے کرتا ہے کہ:۔

در گلستاں دیدمش نشناختم
بر تنش پیراہن گل تنگ بود

جب دوست کے حضور میں سراپا رہین عشق و محبت ہوکر پہونچتا ہے تو سوا اس کے اس کی زبان سے کچھ نہیں نکلتا:۔

کس چہ می داند کہ در بزم تو غمناکم چرا

عمر بھر سر دھنتے رہنے کے لئے یہی ایک مصرعہ کافی ہے۔

(۱۱)

شعر کی جراحی —— یہ تم شعر سمجھنا چاہتے ہو یا اس پر جراحی کرتے ہو۔ شاعری نہ اقلیدس کا مقالہ ہے نہ حدیقۂ حکیم سنائی کہ "دو اور دو چار" کے سے حقایق اس میں نہ پائے جائیں تو درس اخلاق ضرور ہو۔

نقش و نگار سے لطف اٹھانے کے لئے صرف نگاہ سے کام لینا چاہئے، اگر تم نے ان کو کھرچ کر یہ دیکھنا چاہا کہ ان کے پیچھے کیا ہے تو سوا بے آب و رنگ کاغذ کے اور کیا ملے گا؟

غالب کا یہ شعر کتنا پاکیزہ ہے :-

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

لیکن اگر تم نے یہ بحث شروع کر دی کہ غالب کانچ گلانے کے فن سے کب واقف تھا، یا یہ کہ اس وقت بلیماروں میں شیشہ گروں کی دوکانیں کہاں تھیں جہاں انھوں نے آبگینہ پگھلوایا ہوگا یا یہ کہ ساغر میں ڈالنے کے بعد کانچ رقیق کیونکر رہا ہوگا کہ پیا جا سکتا یا یہ کہ اس کے پینے کے بعد کوئی زندہ کیونکر رہ سکتا تھا، تو سوا اس کے کہ سننے والا اپنا منھ پیٹ لے اور کیا کر سکتا ہے۔

جن اشعار کا تم نے مضحکہ اڑایا ہے ان سے لطف اٹھانے کی اہلیت ہی تم میں نہیں۔

ہوتا ہے ازدحام تمنا اسی قدر
ہوتی ہے جتنی دیر کشود نقاب میں

اس شعر کے سمجھنے میں تم نے جس بدتمیزی سے "جنسی جذبات" کا تجزیہ کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ تمھاری انتہائی بدذوقی کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ "فی نفسہٖ شباب" کی بھی توہین ہے۔

ایک شعر سے لطف اٹھانے کے لئے شاعر کی "نفسیات" سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو خود اپنے علوئے نفس سے کام لینا چاہئے۔ اور اسے بھی جانے دو میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمنا کا ایک خاص مفہوم قرار دینا اور پھر لفظ "ازدحام" کی چھان بین میں اتنی بدتمیزی کا اظہار، اس کا تمھیں کیا حق حاصل تھا، جبکہ "کشود نقاب" کی تعیین خود اس کے منافی ٹرتی ہے۔

ایک صاحب تم سے بھی زیادہ خوش تمیز یہاں موجود ہیں۔

غالب کا مشہور شعر ہے :-

میرے ہونے میں کیا ہے رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

انھوں نے رسوائی اور خلوت کو ملا کر ایک عجیب مفہوم پیدا کیا ہے۔ یعنی شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اگر خلوت میں آپ نے مجھے بلا لیا تو رسوائی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ دنیا جانتی ہے میں بالکل ضعیف و ناکارہ ہوں اور کسی کو کچھ شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بولو قایل ہوئے کہ نہیں - اب آؤ گے تو میں تمھیں انھیں کا شاگرد کرا دوں گا، ایسے سخن فہم زمانہ میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔

(۱۲)

شعروپیغام ——— عزیزم ۔ "شاعر" سے یہ مطالبہ کہ وہ کوئی پیغام بھی دُنیا کو پہونچائے، بالکل جدید چیز ہے، خاصکر اس صدی میں جبکہ "ریاضی" ہر چیز کے حدود متعین کرنا چاہتی ہے۔ آپ کا فرمانا درست ہے کہ پہلے شاعر کو "مرفوع القلم و مسلوب الحواس" سمجھ کر انسان صرف اس کی باتوں پر ہنسا کرتا تھا اور وہ بھی جو اس کے منھ میں آتا تھا کہ گزرتا تھا، لیکن یہ سب کچھ بے کار نہیں گیا، شاعر کی یہی دیوانگی آہستہ آہستہ لوگوں میں فرزانگی پیدا کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ زمانہ کا رُخ اِدھر سے اُدھر ہو گیا اور دُنیا وہی کہنے لگی جو شاعر کہتا تھا۔

اب تو خیر مذہب ختم ہو رہا ہے، مگر اُس وقت بھی جب اس کا "بطش شدید" عام تھا، شاعر اتنا ہی آزاد تھا۔ پھر لوگ یہ سب کچھ سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے، خوش ہونا تو معمولی بات ہے، رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی جو اس پر سر دھنتی تھی۔

آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ اس باب میں قدیم شاعر کی خدمات بہت عظیم الشان ہیں۔ آپ "پیام" لئے پھرتے ہیں، میں کہتا ہوں اس نے "کام" کیا ہے، کام!

بات یہ ہے کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور ہر وہ بات جو آزادی سے متعلق ہو انسان کو ہمیشہ اچھی معلوم ہو گی۔ اس میں اب اور جب کی قید نہیں۔

کیا آپ کو حیرت نہیں ہوتی کہ دُنیا نے ——— "خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را" ——— کے باغیانہ درس کو سُنا اور واہ واہ کی۔

ایک ضرب اور ملاحظہ ہو:-

صد کعبہ خلیل گو بنا کن
کفارۂ بت شکستنی نیست

اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں۔

(۱۳)

سعدی کا تغزل ——— کرم فرمائے نیاز مندان، گرامی نامہ نے معزز فرمایا۔ فارسی تغزل کے باب میں آپ سے بہتر سند اور کیا ہو سکتی ہے، میں کیا اور میری رائے کیا۔ آپ سے غالباً یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہو گی کہ میں قدامت پرستی کا دشمن ہوں، لیکن اسی کے ساتھ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ جس حد تک تغزل کا تعلق ہے میں قدامت کا پرستار ہوں۔

نظیری، حافظ اور عرفی اس میں شک نہیں کہ "غزل" کے بادشاہ ہیں، لیکن رات کی تنہائیوں اور پچھلے پہر کے ساعات میں، سوا سعدی کے مجھے کوئی یاد نہیں آتا، ہندی نژاد شعراء میں خسرو کے تغزل کا اسی لئے دلدادہ ہوں کہ اس کے کلام سے بھی وہی "بوئے خوشدلی" آتی ہے۔

یوں ادب و انشاء میں میرا ذوق کافی دقت پسند تھا لیکن غزل میں جہاں کوئی اشکال پیدا ہوا اور مجھے اُلجھن ہوئی۔ صاف و سہل الفاظ، سلجھا ہوا انداز بیان، شگفتہ ترکیبیں۔ یہ ہیں ایک غزل کی خصوصیات، اور فارسی شعراء میں سعدی کے یہاں یہ رنگ اتنا ہی رچا ہوا ہے جتنا اُردو میں میر کے یہاں۔

محبوب کے لئے جان دیدینا، بہت عامۃ الورود خیال ہے اور شعرا نے طرح طرح سے اس کو بیان کیا ہے، لیکن سعدی کی سادگی ملاحظہ ہو

ہمیں حکایتے روزے بدوستاں برسد
کہ سعدی از پئے جاناں برفت وجاں انداخت

لیلیٰ و مجنوں کی تلمیحات کے سلسلہ میں ناقہ ومحمل کے متعلق شاعروں نے اچھے اچھے مضامین اختراع کئے ہیں لیکن سعدی کا جذبۂ بیتاب دیکھئے:۔

بدا رائے ساربان محمل زمانے ۔۔۔ کہ عہدِ وصل را آخر زمان ست

اسی رنگ کا ایک اور شعر سن لیجئے:۔

برقِ یمانی بجست، بادِ بہاری بخاست
طاقتِ مجنوں برفت، خیمۂ لیلیٰ کجاست

غزل کے شعر کی خوبی کا معیار یہ ہے کہ اس کا مطلب بیان نہ ہوسکے۔ سعدی کے ان شعروں کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کیجئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم کسی نازک آبگینہ کو ٹھیس پہونچا رہے ہیں۔ اس "سراپا رہین عشق و ناگزیر اُلفت" کے دو چار شعر اور سن لیجئے:۔

نہ من او فتادہ تنہا بہ کمند آرزویت ۔۔۔ ہمہ کس سرِ تو دارد، تو سرِ کدام داری
باشد کہ تو خود روزے از ما خبرے پرسی ۔۔۔ ورنہ کہ برد ہیہات از ما بتو پیغامے
ہر کہ می بینیدم از بار غمت می گوید ۔۔۔ سعدیا بر تو چہ رنج ست کہ بگداختۂ
آخر من و تو نہ دوست بودیم ۔۔۔ عہد تو شکست و من ہمانم،
لازم ست احتمال چندیں درد ۔۔۔ کہ محبت ہزار چندیں ست
گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی، ۔۔۔ از یک نگاہ کشت و جوابے دگر نداد

تخئیل کی بلندی، بیان کی ندرت، اندازِ بیان کا اچھوتا پن، ترکیبوں کی چستی، مضمون آفرینی تو آپ کو بہت ملے گی، لیکن "فنادگی" جو غزل کی جان ہے۔ سعدی کے سوا کہیں نظر نہ آئے گی۔

(۱۴)

شاعرانہ روح ۔۔۔ صدیقی ۔ نامۂ خلوص کا شکریہ، آپ نے اپنی "کاوش ذہن آزما" کی صراحت نہیں کی لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ ایسے منچلے نوجوانوں کے دل میں کیا ہیجان و تلاطم برپا رہتا ہے۔

"گزر چکے ہیں یہ لیل و نہار ہم پر بھی"

دیکھئے آپ صحیح و تندرست ہو چکے ہیں اور اب اپنی بیماری کا ذکر اس طرح نہ کیجئے گویا آپ کسی گناہ کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ زندگی نام صرف جوانی کا ہے اور شاید ہوسرانی کا بھی، پھر وہ جتنی زیادہ گریز پا ثابت ہو اتنی ہی زیادہ عزیز ہونی چاہئے۔ خیام کا فلسفہ مجھے اتنا زیادہ پسند نہیں جتنا اس کا عمل اگر واقعی کبھی اس نے بادہ خواری کی تھی اس لئے:۔

دراں مقام کہ ساقی قدح بگرداند ۔۔۔ چرا سخن رود از خضر و آب حیوانش

آپ تک تعلق کاروبار فطرت سے رہے میں شاعری کا زیادہ قایل نہیں لیکن ایک ذرا باغیانہ روح اپنے اندر پیدا کر لیجئے پھر دیکھئے گو مدار زیست سوا شاعری کے اور کیا رہجاتا ہے۔ اس سے میری مراد وہ "استغنائے نفس" ہے جو "دیہیم شاہانہ" کے ساتھ عرفی کی زبان سے "گدا کلاہ نمد کج نہاد" کہلوائے بغیر نہ رہ سکا۔ بیدل اس چیز کو یوں ظاہر کرتا ہے :-

خونے بجگر جمع کن و رنگ برون آ

اس کا رنگ زیادہ گہرا ہے اور اسی لئے اس میں ہلکا سا تشاؤم Pessimism پیدا ہو گیا ہے آپ غالب کی زبان میں اسے یوں سمجھئے :-

صد رنگ گل بہ جلوہ برآید بہ نوک خار

جلال آسیر اس سے بھی بڑھ گیا ہے، کہتا ہے :-

میزنم بر سر گلے تا خارے از پا می کشم

بہرحال مدعا یہ کہنا ہے کہ اب آپ ایسی باتیں کرنا چھوڑ دیجئے جن سے دوسروں کا دل دُکھے (خود آپ کو اگر کوئی لطف اس میں آتا ہے تو آیا کرے) اگر آپ خود کسی سے محبت کرنا پسند نہیں کرتے تو دوسروں کی محبت کا امتحان آپ کیوں اس طرح لیتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ محبت کئے جانے کی لذت سے آپ بے خبر نہیں ہیں اور اسی لئے یہ لنترانیاں ہیں۔ نوعمری میں ایسی پختہ کارانہ باتیں کرنا بھی میرے نزدیک لنترانی ہی کی ایک قسم ہے۔

آپ کی نظم کا ایک ایک شعر مستقل صحیفہ ہے — نینی تال آنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں، لیکن مطمئن رہئے میں لکھنؤ کی گرمیوں میں بھی آپ کو نہ بھولوں گا۔

۱۵

مومن کی شاعرانہ عظمت —— گرامی عزیز —— کل شام کو آپ کا لفافہ ملا — آپ کو معلوم نہیں کہ شاعر ہونے سے زیادہ نقاد بننے کی زبردست صلاحیت آپ میں موجود ہے، کیونکہ تخئیل کی وہ (Intensity) جو آپ میں فطرتاً پائی جاتی ہے اس کی متحمل شاعری ہو ہی نہیں سکتی اور بیان کے لئے وہ کچھ اور وسعت چاہتی ہے۔ پھر شاعری کے بعد "بیان کی وسعت" کے معنی سوا "انتقاد" کے اور کچھ نہیں ہوتے، آپ اگر شاعری کبھی کبھی کریں اور یہ "حرکت" اکثر تو خدا جانے آپ کیا قیامت ڈھائیں — آپ نے مومن میں بعض چیزوں کی کمی بتائی ہے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں، پھر مطالعہ فرمائیے، اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو کہتے ہیں، نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کچھ ہے جسے "شعر مطلق" (Absolute Poetry) کہتے ہیں۔ حسنِ مطلق کہیں ہے یا نہیں، اس کو آپ جانتے ہوں گے، مجھے علم نہیں — لیکن مومن کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نے کن حدود کے اندر رہ کر شاعری کی ہے، وہ حدود جو خود اس نے متعین کئے ہیں، وہ نہیں جو ہم چاہتے ہیں، یقیناً اس کی شاعری وہ نہیں ہے جسے ہم "ہم آہنگ لانہایت" (In tune with the infinite) کہہ سکیں لیکن اس کی عظمت اسی میں پوشیدہ ہے کہ باوصف شدید ہونے کے اس میں وہ چیز بھی پائی جاتی ہے، جسے آپ شیو کا رقص موت (The death dance of Shiva) کہتے ہیں۔ میں مومن کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس نے خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھا اور شاید اس کی یہی مبارک غلطی تھی جس نے اسے "شاعر" بنا دیا ورنہ وہ صرف

"عاشق" بن کر رہ جاتا، اور بجائے اس کے کہ ہم اس سے دوسروں کی داستان سنتے، خود اس کی داستان دوسروں سے سننا پڑتی۔ شاعری کی خوبی اس کا (genuine) ہونا ہے "بڑا" (great) ہونے کے بعد وہ شاعر نہیں رہتا، دیوتا ہو جاتا ہے، بہر حال میرے آپ کے نقطۂ نظر میں تھوڑا سا اختلاف ہے اور اسے قایم رہنا چاہئے ۔ "من وتو" ایک ہو جانے کا جامد (Dull) فلسفہ مجھے کبھی پسند نہیں آتا۔

آپ نے اپنی تحریر میں اور بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جن کو پڑھ کر بے اختیار ہو گیا، لیکن خط اور مضمون کے فرق کو باقی رکھنا ہے، اس لئے ضبط سے کام لیتا ہوں، اور آپ کی تحریر کو (stimulus) کی حیثیت سے محفوظ رکھتا ہوں تاکہ آپ سے اجازت لے کر کسی وقت اس کو شایع کردوں اور اسی کے ساتھ جو کچھ مجھے کہنا ہے دل کھول کر کہہ لوں۔

(۱۶)

غالب کی فارسی شاعری ——— مکرمی - تسلیم - غالب کی فارسی شاعری کے متعلق آپ میری رائے مجھ سے صرف ایک جملہ میں چاہتے ہیں، اچھا تو سنئے، غالب ہی کی زبان میں، کہتا ہے :-

نظم غالب نگر کہ پنداری
کز کمیں گاہ جستہ خیلِ غزال

اس وقت تک غالب کی شاعری کے متعلق دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں لیکن خدارا بتائیے کیا اس سے بہتر رائے آپ کی نگاہ سے کبھی گزری ہے اور وہ بھی اتنے مختصر الفاظ میں ! — اب آپ اس کا حقیقی رنگ سخن دیکھئے، الفاظ کے تیکھے پن پر نگاہ ڈالئے۔ بیان کی شوخی و بے باکی کو سامنے رکھئے، طرز ادا کی صفائی و شستگی پر غور کیجئے اور پھر اس بیان پر کہ :-

کز کمیں گاہ جستہ خیلِ غزال

کیا آپ اسے غالب کی شوخ نگاری کا معجزہ نہ کہیں گے ؟

میرے نزدیک غالب نے اپنی عمر میں دو غلطیاں کیں، ایک بہت بڑی اور ایک بہت چھوٹی ۔ بڑی یہ کہ اس نے ریختہ میں شاعری کی اور چھوٹی یہ کہ اس نے فارسی میں غزلیں بھی کہیں، اگر آج اس کا اردو دیوان جسے وہ خود بھی "مجموعۂ بے رنگ" کہتا ہے موجود نہ ہوتا اور جو وقت تغزل فارسی میں صرف کیا ہے وہ مثنوی میں صرف ہوتا تو غالب کی حقیقی عظمت کا اندازہ کوئی کرتا یا نہ کرتا لیکن دنیا اس کا جواب نہ پیش کر سکتی۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ میں اس کے دیوان ریختہ یا تغزل فارسی کا مداح و معترف نہیں ہوں، بلکہ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ فطرت نے اسے جس کام کے لئے پیدا کیا تھا اس کی طرف اس نے پوری توجہ نہیں کی۔

(۱۷)

غالب کی شاعری ——— گرامی عزیز - آپ نے نہایت لطیف بحث چھیڑی ہے اور اتنی خوبصورتی کے ساتھ آپ نے استدلال کیا ہے کہ اس میں قطعاً کسی اضافہ کی گنجایش معلوم نہیں ہوتی۔

ایک ہی شعر میں مادیت سے گزر کر دفعتاً وجدان کی دنیا میں پہونچ جانا اچھے شعراء کے کلام میں بھی کمتر نظر آتا ہے کیونکہ اکثر اس کو بالکل تصوف بنا کر رکھ دیتے ہیں اور بہت کم ایسے ہیں جو تغزل کے حدود سے آگے نہیں بڑھتے، غالب کے کلام میں اسکی مثالیں

اچھی اچھی بنی ہیں - اس کا ایک مشہور شعر ہے :-

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و پرفشانیِ شمع

دوسرا مصرع بالکل مادیت سے تعلق رکھتا ہے، اور پہلا یکسر وجدانیات سے - شاعر "جلوہ ریزی باد" اور "پرفشانی شمع" کو دیکھتا ہے، لیکن فوراً ہی حواس ظاہری کی دُنیا سے گزر کر ذوق و وجدان کے عالم میں پہونچ جاتا ہے اور اتنی خوبصورتی کے ساتھ کہ تغزل میں جان پڑ جاتی ہے - دوسری مثال ملاحظہ ہو :-

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

"لعل و گہر" دیکھ کر جو مادی چیزیں ہیں، شاعر کا خیال فوراً ان کے "اوج طالع" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جو بالکل وجدانی چیز ہے اور غزل کی رنگینی بدستور قایم رہتی ہے - اسی خیال کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے اس نے یوں ظاہر کیا ہے :-

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

غالب کے اور چند شعر اسی رنگ کے سنئے :-

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد — شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے — ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا

اگر آپ اس التزام کے ساتھ مشہور شعراء کے کلام کا انتخاب یکجا کر دیں تو بڑی خدمت ہوگی

(۱۸)

جرأت ——— حضرت، آپ کیوں خواہ مخواہ جرأت کو بُرا کہتے ہیں ——— "کیا تمہارا غریب لیتا ہے" سچ ہے بدا چھا بدنام بُرا - کیا میر کے کلام میں سوقیانہ اشعار نہیں ہیں، کیا مومن اس بد مذاقی سے بالکل بچا ہوا ہے، کیا غالب کا ہر شعر معیار ذوق پر پورا اُترتا ہے، پھر جرأت کو بُرا کہتے ہو تو انھیں بھی کہو -

آپ کہیں گے کہ شاعر کے عام رنگ کو دیکھ کر حکم لگایا جاتا ہے تو کیا جرأت کے کلام کا اکثر حصہ وہی ہے جسے آپ فحش و بازاری وغیرہ خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں -

اچھا بتائیے یہ اشعار کس کے ہیں ؟

میں نہیں ہوں آپ میں مجھ سے نہ سمجھا جائے گا — واں سے آیا ہے جواب خط کوئی سنیو ذرا
جی میں کچھ سو جا گیا ہیں اور دل دھڑکا کیا — جب تلک کرتے رہے مذکور اس کا مجھ سے لوگ
سب نگر بستے ہیں یارب اس نگر کو کیا ہوا — ملک دل میرا سدا سنسان ہی رہتا ہے آہ
خاک ہوتے دیکھتے ہیں جب کسی اخگر کو ہم — خاک ہو جانا دل سوزاں کا کیا آتا ہے یاد

لوگ سب کہتے ہیں اس بیمارِ غم کو کیا ہوا — جانتے ہم بھی نہیں ہیں یہ کہ ہم کو کیا ہوا
دل ہے جب تک عشق کا انکار کر سکتے نہیں — پردہ جب پوچھے ہے تو اقرار کر سکتے نہیں
یارو کہو ہر بار نہ کچھ کان میں اپنے — کیا جانیں کہ ہم بیٹھے ہیں کس دھیان میں اپنے
اس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا، — جادو برحق ہے کرنے والا کافر،
پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری — وہ منھ کو پھیر کے کہتا ہے اُف پناہ تری

غضب خدا، جس کے دیوان میں سیکڑوں اشعار اس رنگ کے پائے جائیں، اسے آپ "لغو گو بازاری" کے نام سے یاد کریں۔

(۱۹)

شاعرانہ نکتہ وری —— جناب محترم! —— تسلیم، آپ نے شاعری کی جتنی تقسیمیں اندازِ بیان کے لحاظ سے کی ہیں، ان سے مجھے بالکل اتفاق ہے لیکن مبالغہ کے علاوہ ایک قسم اور بھی ہے جس کو نکتہ وری کہتے ہیں۔ میں ذرا وضاحت کر دوں۔

ایک شاعری تو یہ ہوئی کہ عامۃ الورود واقعات کے لئے سہل و سادہ الفاظ اور سلیس اندازِ بیان سے کام لیا جائے جو فارسی میں سعدی کا اور اُردو میں میر و درد کا رنگ ہے۔ مثلاً:۔

یاں سے واں، واں سے یہاں حکم ہوا وصل کی شب — ہم اُٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا
درد او حسرتا کہ عنانم ز دست رست — دستم نمی رسد کہ بگیرم عنانِ دوست
جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے — ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں
تراچہ غم کہ مرا در غمت نگیرد خواب — تو بادشاہ کجا یاد پاسباں آری
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

یہ تو ہوئی وہ حقیقی شاعری (شاعری سے میری مراد یہاں صرف تغزل ہے) جسے ہم صرف محبت کی زبان کہہ سکتے ہیں) اب اس کے بعد اندازِ بیان میں جس قدر زیادہ پیچیدگی و نزاکت پیدا ہوتی جائے گی، کیفیاتِ عشق اتنی ہی ضعیف ہوتی جائیں گی۔ اور آرٹ ان کی جگہ لے لیگا۔ اور یہیں پہونچکر ایک شاعر کے حقیقی جوہر کھلتے ہیں کہ وہ کس حد تک آرٹ کو تغزل میں تحلیل کر سکتا ہے اور جذبات کے فقدان کی تلافی وہ آرٹ کے ذریعہ سے کس حد تک کر سکتا ہے۔ غالب کی غزلوں میں یہ تمام مدارج اکثر نظر آتے ہیں، مثلاً اس کی وہ غزل لے لیجئے۔ آجائے ہے، پاجائے ہے۔ اس میں صحیح تغزل کا شعر ملاحظہ ہو:۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے، — دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

اس کے بعد یہ جذبات کم ہوتے ہیں اور آرٹ شامل ہوتا ہے لیکن تغزل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مثلاً:۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

غالب ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے لیکن ناگوار صورت پیدا نہیں ہوتی:۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے — آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

یہ آرٹ کے استعمال کی آخری حد ہے لیکن غالب اس سے اور آگے بڑھ جاتا ہے اور اب جو کچھ کہتا ہے وہ یکسر تغزل سے باہر ہے، اور صرف آرٹ ہی آرٹ رہ جاتا ہے، ملاحظہ ہو:۔

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں　　کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھینچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد　　پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

یہ وہ اشعار ہیں کہ اگر وزن و قافیہ علٰحدہ کر کے ان کا ترنم دور کر دیا جائے تو دل و دماغ کے علاوہ سامعہ کو بھی ناگوار ہوں یہ مبالغہ ہوا نکتہ دری نہ ہوئی۔

مبالغہ میں حسن پیدا ہو سکتا ہے لیکن آسانی سے نہیں، فارسی میں اس کی مثالیں تو مل جائیں گی، مگر اردو میں بہت کم۔ بیدل کی شاعری میں اس رنگ کے اشعار اکثر نظر آتے ہیں اور یہ اس کا معجزہ ہے کہ تغزل سے کسی جگہ نہیں ہٹتا، کہتا ہے

باغے کہ بہارش ہمہ رنگ ست دلِ او
دشتے کہ غبارش ہمہ سنگ ست دلِ ما

اس سے زیادہ آرٹ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اضداد کو یکجا کر دیا جائے، لیکن بیدل کا کمال ہے کہ "پتھر، پانی اور خاک" سب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس نے اس طرح پیش کر دیا کہ تنافر محسوس کرنے کے بجائے آپ کو ایک خاص کیفیت محسوس کرتے ہیں، ایک شعر اور سنئے:-

کف خونے کہ دارم تا چکیدن خاک می گردد
چساں گیرم بہ ایں بے مائگی دامان قاتل را

مصرعۂ اول میں جو دعوے کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں، لیکن دوسرے مصرعہ میں اس غضب کی کشش ہے کہ ذہن کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ خون کے خاک ہو جانے پر غور کرے۔

دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

زنیرنگِ فسوں پردازیِ الفت چہ می پرسی
تو در آغوشی و من گشتۂ از دور دیدنہا

یہاں بھی وہی جمع اضداد ہے یعنی قریب بعید کو ایک کر دیا ہے، لیکن آپ اسے مبالغہ قطعاً نہیں کہہ سکتے پھر یہ کیا ہے؟ وہی نکتہ دری۔

بیدل کے بعض اشعار اس معیار سے گرے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور باوجود مبالغہ نہ ہونے کے بھی ان میں کوئی نکتہ آفرینی نہیں پائی جاتی، یعنی ادعائے شاعرانہ تو ہے لیکن ثبوت اچھا ہم نہیں پہونچ سکا۔ مثلاً:-

دل گم گشتہ سراغے ست ز کیفیتِ شوق
نشہ بالد اگر از دست رود شیشۂ ما

ایک شعر ایسا ہی اور سنئے:-

عیش داند دلِ سرگشتہ پریشانی را
ناخدا باد بود کشتیِ طوفانی را

اس میں بھی کوئی بات نہیں۔ الغرض مبالغہ اور نکتہ دری میں فرق کرنا ضرور ہے، اگر آپ اس بیان کو بھی شامل کر لیں تو

آپ کا مقالہ ہر لحاظ سے مکمل ہو جاتا ہے۔ سمع خراشی معاف!

(۲۱)

کلام غالب —— مکرمی! —— ابواب کی تقسیم عنوانات کی فہرست اور ترتیب کی نوعیت، آپ کے خط سے معلوم ہو گئی۔ خوب ہے، غالب کے متعلق لکھتے رہنے کا لوگوں کو جنون ہو گیا ہے، لیکن اس دفتر بے پایاں میں کام کی باتیں بہت کم ملتی ہیں۔ شرح کے سلسلہ میں تو خیر لوگوں نے ایسی عجیب و غریب حرکتیں کی ہیں کہ ہنسی آتی ہے، لیکن تذکرہ و انتقاد کی حیثیت سے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی ہنوز محتاج تکمیل ہے۔ آپ کی کتاب مجھے زیادہ کام کی چیز معلوم ہوتی ہے، اسے جلد پورا کر کے چھپوا دیجئے۔

آپ نے چونکہ مشورہ کا شدید تقاضہ کیا ہے۔ اس لئے "کچھ نہ کچھ کہنے" کے طور پر کہوں گا کہ انتقاد کے سلسلہ میں نفسیاتی پہلو کو آپ نے بھی نظرانداز کر دیا۔

نقد و تبصرہ کے دو پہلو ہیں! ایک کا تعلق نقاد کے زاویۂ نگاہ سے ہے (اور اسی کو سامنے رکھ کر لوگ زیادہ طبع آزمائی کرتے ہیں) دوسرا پہلو خود شاعر کا نقطۂ نظر ہے، اور اس پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

ایک نقاد اس وقت تک صحیح نقد نہیں کر سکتا، جب تک وہ اپنے زمانہ کو چھوڑ کر شاعر کے زمانہ میں پہونچ جائے اور اپنی ہستی سے علٰحدہ ہو کر شاعر کی ہستی نہ اختیار کرے، اس کے لئے ایک خاص قسم کی دوربینی (Thelescopic) مطالعہ کی ضرورت ہے، جو آسان نہیں۔ مثلاً غالب ہی کو لیجئے کہ جب تک آپ بہادر شاہ کی دلی تک نہ پہونچیں اور غالب کی سی ذہنیت اپنے اوپر طاری نہ کر لیں۔ اس وقت تک اس کے کلام پر کوئی صحیح تبصرہ نہیں کر سکتے، اسی کو میں نفسیاتی انتقاد کہتا ہوں۔

اس سلسلہ میں غالب کی ہر غزل، اس کے ہر ہر شعر پر غور کرنا ہوگا۔ یعنی اس کا کلام سامنے رکھ کر ہم کو غالب کی جذباتی زندگی کی ایک ایسی تاریخ مرتب کرنا ہوگی جو اس کے سیاسی، اقتصادی و تمدنی ماحول سے علٰحدہ نہ ہو، اسی کے ساتھ آپ کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس نے کتنی غزلیں مقررہ طرحوں پر لکھی ہیں، اور کتنی غزلوں کی زمین خود اس نے پیدا کی ہے! پھر اگر کوئی زمین خود اس نے پیدا کی ہے تو کیوں؟ ظاہر ہے کہ پہلے کوئی مصرعہ یا شعر بے اختیار ہو گیا ہوگا، اور پھر اس پر غزل کہی ہوگی۔ مثلاً۔ غالب کی ایک مشہور غزل ہے "زبوں وہ بھی، خوں وہ بھی" میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے لئے پہلے کوئی طرح مقرر ہو چکی تھی، بلکہ خود غالب کی پیدا کی ہوئی زمین معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ زمین کیوں اس کے ذہن میں آئی۔ یقیناً کوئی نہ کوئی شعر یا مصرعہ بے اختیار ہو گیا ہوگا اور پھر اس پر غزل لکھی ہوگی، اب آپ پوری غزل پڑھ جائیے، اور غور کیجئے کہ اس میں کون سا شعر یا مصرعہ بے اختیارانہ نظم ہو گیا ہوگا۔ میری رائے میں سب سے پہلے مقطع غالب کے ذہن میں یہ آیا ہوگا!

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

مقطع کے بعد اس کو فکر ہوئی ہوگی کہ ردیف و قافیہ کیا ہونا چاہئے، اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ بغیر قافیہ کے صرف "بھی" (ردیف) کو سامنے رکھ کر غزل کہہ ڈالتا، لیکن غالب کی مشکل پسند طبیعت کے لئے کہوں کو قافیہ قرار دے کر غزل کہنا مشکل نہ تھا، جبکہ زبوں، خوں، واژگوں اور جنوں ایسے اچھے اچھے قافیے موجود تھے، پھر دیکھئے کہ ردیف کو غالب نے اس غزل میں جس خوبصورتی کے ساتھ نباہا ہے وہ ہر شخص کا کام نہ تھا۔ مطلع کہنا اور زیادہ مشکل تھا۔ لیکن باوجودیکہ دونوں مصرعوں میں ردیف کا تعلق ایک ہی چیز یعنی "دل"

سے ہے۔ لیکن وہ کسی جگہ بیکار نہیں۔ میں اس غزل کو غالب کی زندگی کا خاص کارنامہ سمجھتا ہوں، اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس زمانہ میں ماحول کا جو رنگ تھا، اس میں یہ غزل پوری طرح رچی ہوئی ہے، اور غالب کے صحیح جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے!

آپ غالب کی مشکل زمینوں میں کوئی نہ کوئی شعر یا مصرعہ ایسا ضرور پائیں گے، جو غزل کی بنیادی چیز ہوگا! مثالاً چند مشکل زمینوں کے بنیادی مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

ایک غزل ہے "لیالی نے مجھے۔ نہالی نے مجھے"۔ لیکن اس کا بنیادی مصرعہ یہ ہے:۔

عجیب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے!

غالب نے بہت کوشش کی کہ وہ اس زمین میں پوری غزل کہہ سکے لیکن اول تو چار شعر سے زیادہ وہ فکر نہ کر سکا اور جو اشعار کہے، وہ بھی کسی قابل نہیں ہیں، یہاں تک کہ اس بنیادی مصرعہ پر بھی کوئی اچھا مصرعہ ہاتھ نہ آیا۔

اس غزل کی ناکامی کا سبب صرف یہ تھا کہ جس جذبہ کے تحت وہ ایک مصرعہ ہو گیا تھا، اس کو سنبھالنے والے قافیئے دوسرے میسر نہ آسکے اور غزل "برائے گفتن" کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکی۔

یہی حال بالکل پہلی غزل کا ہے کہ سوا بنیادی مصرعہ "صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا" کے اور کوئی شعر یا مصرعہ پیدا نہ ہو سکا

بہرحال کلام غالب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے اور اگر آپ نے کوئی عنوان "نفسیاتی" گفتگو کے لئے الگ کر لیا ہے، تو اس سلسلہ میں یہ بحث بہت پُر لطف رہے گی۔ اگر زحمت نہ ہو تو مطلع فرمایئے کہ آپ نے اس خیال کو پسند کیا یا نہیں!

(۲۲)

شعر غالب ——— مکرمی! ۔تسلیم ۔ شعر و شاعری میں آپ کی ژرف نگاہی کا قایل ہوں، لیکن بعض اوقات آپ اسقدر میکانکی (Mechanical .) قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ ان کا جواب ممکن ہو یا نہ ہو، لیکن شعر کا لطف یقیناً خاک میں مل جاتا ہے!

جس زاویۂ نگاہ سے آپ نقد فرماتے ہیں وہ اتنا تنگ ہے کہ مشکل ہی سے شعر کی وسعتیں اس سے ناپی جا سکتی ہیں! لیکن چونکہ اس میں منطق ہوتی ہے، اس لئے کوئی معقول جواب بھی نہیں دیا جا سکتا۔

پھول، خوشبو، رنگ، موسیقی اور شاعری سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں، جن سے ریاضی والی ذہنیت بہت کم لطف اُٹھا سکتی ہے۔ مگر پھول کے رنگ و بو سے لطف اُٹھانے والے پنکھڑیوں کی ناہمواری کو نہیں دیکھتے اور موسیقی پر وجد کرنے والے ساز کے حسن و قبح سے بے نیاز ہوتے ہیں!

آپ کی کیمیاوی اور میکانکی ناپ تول اپنی جگہ بالکل درست، لیکن شعر سے اس کا کیا تعلق ہے، اس کا مقیاس تو صرف وجدان ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائے کہ "ہاں" اور

کتنا پاکیزہ شعر ہے، ذوق اس کو سُن کر کس قدر آسودہ ہوتا ہے، لیکن آپ کے منطقیانہ نقطۂ نظر سے یہ بالکل مہمل قرار پائے گا جلاد کا کام یہ ہے کہ وہ تلوار سے کر ایک بار سر اُڑا دے، اس میں "ہاں اور" کی گنجائش کہاں؟ جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضروری نہیں

کہ ایک ہی ضرب میں سر اُڑ جائے، ہو سکتا ہے کہ جلاد کی پہلی ضرب میں غالب کی گردن کا صرف ایک حصہ کٹا ہو، اور جب جلاد نے ہاتھ روک لیا ہو تو محبوب نے "ہاں اور" کہا ہو۔ لیکن یہ جواب اعتراض سے زیادہ لغو گا۔

ایک اور شعر سنئے:۔

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

اہلِ ذوق کے نزدیک یہ شعر غالب کے بہترین اشعار میں سے ہے لیکن منطق سے کام لیجئے تو یہ بھی جہل نظر آئے گا۔ "مرا ہونا" کہاں ہونا؟ قفس میں، بالکل ٹھیک۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "نواسنجانِ گلشن" کو غالب کا وجود چمن میں کیوں ناگوار ہے، کیا اس لئے کہ وہ قفس میں ہے، نہیں، بلکہ صرف اس بنا پر کہ وہ شیون کرتا رہتا ہے۔ پھر ایسی صورت میں کہ "نواسنجانِ گلشن" غالب کے شیون ہی کو پسند نہیں کرتے خواہ وہ قفس میں ہو، یا قفس سے باہر!۔ یہ کہنا کہ "مرا ہونا بُرا کیا ہے" کوئی معنی نہیں رکھتا، اور غالب کی طرف سے گلشن میں رہنے کا یہ استدلال بالکل جہل ہے۔

ایک اور شعر:۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

اول تو رنگ اُڑنے کے بعد اس کا اور زیادہ کھل جانا ضروری نہیں لیکن اگر ایسا ہو بھی تو نزاکت سے اسے کیا واسطہ۔ نزاکت کا تعلق رنگ سے نہیں، بلکہ جسم کی ساخت سے ہے۔ لیکن غالب نزاکت کے ثبوت میں صرف رنگ اُڑ جانا پیش کرتے ہیں علاوہ اس کے "پری رُخ" کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ کسی کو "پری رُخ" کہنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ رنگ و نقشہ کے لحاظ سے وہ معیاری حُسن رکھتا ہے، اس لئے رنگ اُڑنے کے بعد اس میں رنگ کھلنے کی گنجایش کہاں؟۔ بہرحال اس قسم کی گفتگو سے ہر اچھے سے اچھے شعر کو مکروہ دکھا سکتے ہیں!

آپ میں بھی کبھی کبھی یہی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے آپ کے (Humour) پر توصیقل ہو سکتی ہے لیکن لطف شعر سے آپ محروم ہو جاتے ہیں۔ اسے چھوڑئے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، پھول کی پنکھڑیاں نہ دیکھئے۔ بلکہ صرف اس کی خوشبو سے لطف اُٹھایئے، علاوہ اس کے یوں بھی شاعروں کو دُنیا میں جینے کا حق حاصل ہے۔ اگر آپ نے اتنا پریشان کیا تو وہ غریب کیا کریں گے!

(۲۳)

اُردو انشاپردازی ——— گرامی عزیز!——— آپ کا ادبی ذوق اور اُردو سے عشق دونوں مسلّم، لیکن اس ذوق کی پختگی، اور اس عشق کی کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ صرف شعر گوئی کو منتہائے نظر سمجھ لیں۔ سب سے پہلے آپ فارسی کی تکمیل کیجئے، اسکول و کالج والی فارسی نہیں، بلکہ رسایل طغرا، بدر چاچ، ظہوری، عرفی، بیدل اور غالب والی کلاسکل فارسی اور اسی کے ساتھ عربی بھی اتنی سیکھ لیجئے کہ اس زبان کے الفاظ کا صحیح استعمال آپ کر سکیں، انگریزی آپ جانتے ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ شعر اچھا کہنے لگیں، لیکن اُردو کی انشاء پردازی آسان نہیں، اس کے لئے ذوق سے زیادہ اکتساب کی ضرورت ہے!

انشا و جرأت ——— مکرمی ! - یہ بالکل درست ہے کہ [۲۴] "ہر وہ بات جو مشہور ہو جائے صحیح نہیں ہوتی" اور ہماری انفرادی غلطیوں کا اجتماعی صورت اختیار کر لینا، اس میں شک نہیں بڑی افسوسناک بات ہے - آج خدا جانے کتنے مقدس مزار ایسے ہیں جن میں آج تک کوئی دفن ہی نہیں کیا گیا - اور تاریخ کی کتنی مشہور ہستیاں ایسی ہیں جو کبھی پیدا ہی نہ ہوئی تھیں - پھر اگر شاعری کی دنیا میں بھی یہ اندھیر نظر آئے، تو حیرت کی کیا بات ہے ؟

اس میں شک نہیں کہ جرأت پر صرف بازاری شاعر ہونے کا الزام یقیناً غلط ہے، اور اس کے ثبوت میں جس قسم کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں، اُن سے زیادہ عریاں میر کے یہاں بھی ہیں - مگر میر کو کوئی کچھ نہیں کہتا !

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس بدنامی کا تعلق اُس زمانہ سے ہے جب درباری داری کے سلسلہ میں انشاء و جرأت کے دو اکھاڑے لکھنؤ میں قائم ہو گئے تھے - اور ہر فریق دوسرے کو ذلیل کرنے کے لئے گندگی اُچھال رہا تھا - اسی مسخرہ پن نے انشا کو اسکے اصلی مرتبہ تک پہونچنے سے روکا، اور جرأت کو بدنام کیا، لوگ جرأت و انشاء کا مقابلہ کرنے میں انشاء کو ترجیح دیتے ہیں - اور ہو سکتا ہے کہ ہجو و طنز کے لحاظ سے یہ فیصلہ صحیح ہو، لیکن غزل گوئی کے لحاظ سے اس کو جرأت سے کوئی نسبت نہ تھی -

اول تو انشاء کا سرمایۂ تغزل بہت کم ہے اور جو ہے بھی اس میں بہت کم اشعار قابل انتخاب نظر آتے ہیں - برخلاف اس کے جرأت کے دواوین کی تعداد نو (۹) بتائی جاتی ہے، اور ان میں اتنے اچھے اشعار پائے جاتے ہیں کہ سخت انتخاب کے بعد بھی دیوان انشاء سے کئی گنا زیادہ اس کے دیوان کا حجم ہو جاتا ہے -

یہ صحیح ہے کہ جرأت کے یہاں شوخی و عریانی بھی پائی جاتی ہے، اور انھوں نے معاملات حسن و عشق کے بیان میں ادنیٰ قسم کے شہوانی و جنسی جذبات سے بھی کام لیا ہے - لیکن یہ غالباً جرأت کا اصلی رنگ نہ تھا، اور صرف اس عارضی ماحول کا نتیجہ تھا جو لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں پیدا ہو گیا تھا -

میرے پاس تو اس کے دواوین نہیں ہیں - اگر آپ کے پاس ہوں تو تمام وہ اشعار جنھیں عریاں کہا جا سکتا ہے، چھانٹ لیجئے اور مجھے بتائیے کتنے ہیں - میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ سَو دو سَو ہوں گے، برخلاف اس کے دوسرے رنگ کے اشعار جن میں میر کا سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے بہت زیادہ تعداد میں نظر آئیں گے -

حیرت کی بات ہے کہ جرأت کے ان اشعار کا ذکر تو ہر جگہ ہے :-

دیکھا تو یوں وہ کہنے لگے منہ کو ڈھانپنے ۔۔۔ کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا ۔۔۔ چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

لیکن ان شعروں کا ذکر کوئی نہیں کرتا :-

ترے بن دیکھے جرأت کی یہ حالت ہو گئی غم سے ۔۔۔ کہ اپنے سے تو اس کو پھر نظر دیکھا نہیں جاتا

کیا طبیعت ہے اداس اب بیچ ہے، اے جرأت یہ بات ۔۔۔ جی کہیں لگتا نہیں، جب دل کہیں لگ جائے ہے

اب تو ہر ہر بات پر آزردگی آنے لگی، ۔۔۔ میری بے تابی جو اس بیدرد کو بھانے لگی

یہ نہ کہہ یاد آئی کس کی، جو کلیجہ پر مرے ۔۔۔ سانس کے لینے میں اک برچھی سی لگ جانے لگی

ناصحا اس کو چھوڑ دیں کیونکر ! ۔۔۔ جس کو پایا ہو جان کھو کھو کے !!

کل جو بیٹھا پاس میں یکجا ترے ہمنام کے
رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجہ تھام کے

نہ کوئی دوست، نہ مہرباں، نہ شفیق ہے نہ رفیق یاں
کریں کس سے ہم غم دل بیاں جو سخن کے تھے شنوا، گئے

مجھے جرأت اب نہیں کچھ خبر، گئے عقل و ہوش و خرد کدھر
یہ مرے پیامبر آن کر مجھے کیا پیام سنا گئے

جب تلک کرتے رہے مذکور اس کا مجھ سے لوگ
جی میں کچھ سوچا کیا میں، اور دل دھڑکا کیا!

قفس میں ہمصفیرو کچھ تو مجھ سے بات کر جاؤ
بھلا میں بھی کبھی تھا رہنے والا اس گلستاں کا

کیا اس عشق کی وحشت نے کیا دیوانہ جرأت کو
عجب احوال ہم نے دیکھا، کل اس خانہ ویراں کا

واں سے آیا ہے جوابِ خط، کوئی سنیو ذرا
میں نہیں ہوں آپ میں مجھ سے نہ سمجھا جائے گا

شکر تم آ گئے گھر اس کے، نہیں جرأت نے
سر اٹھا کر ابھی دیوار سے مارا ہوتا!

آج اس کوچہ میں کیا جا کے تو سن آیا ہے
جرأت ایسا تو کبھی آ گے تو خاموش نہ تھا

آج کی رات کٹے دیکھئے کس شکل سے آہ،
اس نے پھر وعدۂ دیدار سحر پر رکھا،

ناصحو آپ میں جرأت نہ رہا
اب سمجھ کر اسے سمجھائے گا

اپنے پہلو سے وہ اٹھ کے چلا اے جرأت
اس کا منہ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم

ہے وقتِ خوش انھوں کا کیا لطف ہمدگر ہیں
دل جن کے مل رہے ہیں اور پاس پاس گھر ہیں

جرأت کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ میر کے رنگ کا دلدادہ تھا اور اسی رنگ میں شعر کہنا کمالِ تغزل جانتا تھا چنانچہ ایک غزل میں کہتا ہے :-

جرأت، جواب میر تو ایسا ہی کہہ کہ اب
چاروں طرف سے شور سنے واہ واہ کا

پھر اسی زمین میں دوسری غزل کہکر اسے یوں ختم کرتا ہے :-

آوارہ دربدر ہوں میں جرأت بقولِ میر
"خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا"

اگر اسی سلسلہ میں اس کے اُستاد حسرت کو بھی لے لیں تو کیا کہنا! - اس کے بھی شاید دو دیوان تھے، لیکن اب نہیں ملتے! ذکر آ گیا، تو چند اشعار سن لیجئے :-

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

اسی زمین کا ایک شعر سنئے، کیا قیامت ہے :-

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

اے دل اگر تڑپنا تیرا یہی رہے گا،
کاہے کو تو جئے گا، کاہے کو جی رہے گا

رہنے دے مے کو ساقی ہم تو چلے یہاں سے
قسمت میں جس کے ہوگا، سو جام پی رہے گا

بھولتا ہی نہیں وہ، دل سے اُسے
ہم نے سو سو طرح بھُلا دیکھا

پٹکنے دے مجھے سر اس کے آستانے سے
خبر کروں ہوں میں اپنی اسی بہانے سے

سراغ پوچھوں میں کیا اشک و آہ کا دل سے
کہ اس دیار سے کتنے ہی قافلے نکلے!

جگر کے زخموں کو جانا تھا بھر چلے حسرت — خراشِ ناخنِ غم سے وہ سب چھپلے نکلے

آخر ترے غم میں مر گئے ہم — بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم

تیرا تو جب اعتبار کیجئے — جب ہووے کچھ اعتبار اپنا

ہر چند یہ زمانہ اب غزلوں پر سر دھننے کا نہیں ہے، لیکن ہم آپ اس زمانہ کے ہیں کب ؟ ہم آپ جب مل بیٹھیں گے، ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کریں گے، اوروں کے لئے نہیں، اپنے لئے۔ جب کوئی غیر اس صحبت میں آجائے گا، تو سنبھل بیٹھیں گے ایک لطیفہ یاد آگیا، سُن لیجئے :- "دو سر پھرے آپس میں بیٹھے ہوئے نہایت مزے کی بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے، کہ ایک تیسرا شخص اور آتا ہوا دکھائی دیا۔ جو اُن کے ذوق و صحبت کا نہ تھا۔ انھوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور بولے کہ:-

"آؤ اب سمجھ کی باتیں کریں، ایک بیوقوف آرہا ہے"۔

(۲۵)

غالب اور میرزا مظہر —— از غبارِ شوق طرحِ منزلِ کعبہ دل ریختند

گرد رہِ بر داشتند و رنگِ منزل ریختند

یہ شعر غالب کا نہیں، جلال اسیر کا ہے، لیکن ہے غالب ہی کے رنگ کا، آپ کا یہ دھوکا آپ کی خوش ذوقی کی دلیل ہے ! مرزا مظہر جانجاناں کا ذکر البتہ اس سلسلہ میں بے محل ہے، ان کے تغزل کو اس رنگ سے کوئی تعلق نہیں، یقیناً ان کے کلام میں کہیں کہیں شوخی ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن غالب کا تیز طنزیاتی رنگ کہاں، علاوہ اس کے تراکیب و الفاظ کا وہ شکوہ بھی نہیں جو غالب کا حصہ تھا، ہاں جس حد تک جذبات کا تعلق ہے وہ بے شک غالب سے آگے بڑھ کر خسرو و حسن تک پہونچ جاتے ہیں !

غالب کے محاکاتی رنگ میں وہ زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں :-

محفلے خواہم کہ آنجا وصلِ جاناں رو دہد — گوشۂ ابرو جوابِ گوشۂ ابرو دہد

لیکن یہ ان کا اصلی رنگ نہیں، ان کے کلام کی خصوصیت، اس کا کیفیاتِ عشق میں ڈوبا ہوا ہونا ہے ! مثلاً :-

امتحانِ صبرِ عاشق ایں قدر ہا خوب نیست — اے بقربانت روم آخر دلم ایوب نیست

غلامِ عشقم و لطف و کرم بہائے من ست — کسے کہ بندہ بخواند مرا خدائے من ست

نگوئید آہ، پیشِ من نگوئید — کہ معشوقی کسے عاشق نوازست

کیست امروز بجز مظہرِ دیوانۂ ما — آنکہ ہر شب بہ تمنائے تو صد بار گریست

نے فرصتِ اشکے، نہ قرار صحبتِ آہے — دارم بہ رخِ دوست غریبانہ نگاہے

(۲۶)

نثر و شعر کا فرق —— بندہ نواز ! - "ما لہٗ و ما علیہ" دیکھ کر آپ جس نتیجہ پر پہونچے ہیں ! وہ یقیناً درست ہے۔ شاعری کے باب میں میرا نظریہ صحیح ہو یا غلط، ہے ذرا دشوار پسند ! اگر شاعری کا مقصود صرف ایک بات کہہ دینا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ بات کس انداز سے ظاہر کی گئی ہے، تو پھر نہ صرف شاعری بلکہ محاورہ و زبان کے قیود بھی بیکار ہیں !

شاعری نہایت نازک آرٹ ہے اور جب تک ہم اس کی تمام خصوصیات کا لحاظ نہ رکھیں، اس کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ بہترین نقش وہ ہے جس میں کسی ایک خط یا ایک نقطہ کا بھی حذف و اضافہ نہ ہو سکے! اسی طرح بہترین شاعر وہ ہے جو فنی و جذباتی لحاظ سے کسی تغیر و تبدل کا متحمل نہ ہو جس طرح نقش میں مختلف رنگوں سے گلکاریاں کی جاتی ہیں، اُسی طرح شاعری میں تشبیہات و استعارات سے رنگینیاں پیدا کی جاتی ہیں، پھر رنگوں کا استعمال آسان نہیں! وقت، موضوع، اور غایت کے لحاظ سے ان کے امتزاج کا انداز اور اثر اندازی کی غرض سے ان کے مختلف (SHADES) نقش و شعر دونوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ رہا اندازِ بیان سو وہ در زیادہ اہم ہے، کیونکہ اس کو شاعری میں وہی درجہ حاصل ہے جو نقش میں زاویا کو، اگر نقش میں زاویا کا لحاظ نہیں رکھا گیا وہ بالکل (FLAT) ہو کر رہ جائے گا۔ اگر شاعری میں انداز بیان کی ندرت و پاکیزگی ملحوظ نہ رہی تو وہ نثر ہو جائے گی!

یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک شاعر بسا اوقات اپنے جذبات و تاثرات سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ پر غور کرنے کا اہل نہیں رہتا اور سمجھتا ہے کہ جس طرح میں اپنے شعر پڑھ کر اپنا مافی الضمیر جان لیتا ہوں اسی طرح ہر شخص کو سمجھ لینا چاہئے، لیکن ایسے مغلوب الحال لوگ تصوف میں بھی کوئی مرتبہ نہیں رکھتے، اور شاعری میں بھی ان کو ناقص سمجھا جاتا ہے، ایسی شاعری مجذوبانہ کیفیت تو بے شک رکھ سکتی ہے، لیکن سالکانہ نہیں!

نثر و شعر میں واقعی فرق ہے، لیکن مقطوع و مجروح قسم کی نثر کو شعر کہنا کیونکر درست ہو سکتا ہے، آج کل ایک اصطلاح "اشاریت" پیدا ہوئی ہے، لیکن یہ کوئی نئی چیز نہیں، کنایہ، استعارہ اور بیان مجاز ہماری شاعری میں ہمیشہ پایا گیا ہے اور "اشاریت" کے حدود ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے، ابہام و اہمال کو ہمیشہ بُرا سمجھا گیا ہے اور سمجھا جائے گا! خواہ وہ نتیجہ اشاریت کا ہو یا استعارہ و کنایہ کا۔

اساتذۂ قدیم میں مومن کے یہاں یہ "اشاریت" کہیں کہیں معمہ و چیستان کی حد تک نظر آتی ہے، لیکن یہ کوئی عمدہ بات نہیں، اور اسی وجہ سے مومن کی کافی قدر نہ ہو سکی، مومن کی وہ خصوصیت جو کسی اور سے نہ نبھ سکی، عام واردات محبت کے اظہار میں اس کی تلخ حقیقت نگاری تھی، اسلوب بیان کے لحاظ سے غالب کا ہمسر کوئی نہیں ہوا، وہ ایسے اچھوتے زاویے تلاش کرتا ہے کہ حیرت ہو جاتی ہے، پامال یا گھٹیا بات بہت کم اس کی زبان سے نکلتی تھی!

اس میں شک نہیں کہ نہ صرف غزل گوئی، بلکہ عام شاعری قدیم ٹکنک اور فرسودہ اندازِ بیان کے لحاظ سے بار خاطر ہو چکی تھی اور اس میں یقیناً تبدیلی کی ضرورت تھی، چنانچہ ہوئی یہاں تک کہ آج کل نو مشق شعراء کے کلام میں بعض بعض اشعار ایسے نظر آ جاتے ہیں کہ انسان چونک پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ نئے تاثرات و تجربات کے اظہار کے لئے زبان و اندازِ بیان میں بہت سی جدتیں کرنا پڑیں گی، لیکن "جدت محض" کوئی چیز نہیں، اگر اس سے مقصود پورا نہیں ہوتا۔ مقصود پورا ہونے سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو ہم کہتے ہیں، اُسے دوسرے سمجھ بھی لیں اور اسی کے ساتھ شعر کی فنی خصوصیات بھی مجروح نہ ہوں۔ میں آزاد شاعری کا مخالف ہوں، نہ نظم معرّا کا، مجھے اختلاف صرف ابہام و اہمال سے ہے اور اس بات سے کہ جو بات جس طرح نہ کہنی چاہئے، اُسے اس طرح نہ کہا جائے، بہرحال شاعری جدید ہو یا قدیم، میں اس میں لفظ و معنی دونوں حیثیت سے بہت پختگی، خوش سلیقگی اور صفائی چاہتا ہوں، یہ میرا فطری ذوق ہے، حتے کہ بستر کی چادر میں اگر ذرا بھی شکن ہو تو مجھے کبھی نیند نہ آئے گی اور خشکہ کو مزعفر و بریانی سمجھنے پر کبھی راضی نہ ہوں گا!

ہر چند خود میں نے شعر کہنا عرصہ سے چھوڑ دیا ہے، لیکن مطالعۂ شعر کا ذوق اب تک نہیں چھوٹا، پھر باوجود اس کے کہ قدیم رنگ مجھے پسند نہیں۔ مکمل شعر اسی میں ملتے ہیں، اور جدید شاعری میں باوصف بے شمار ندرتوں کے بہت کم ایسے شعر نظر آتے ہیں، جن کو ہر لحاظ سے مکمل کہا جائے۔

اس کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ لفظ و معنی میں توازن قایم نہیں ہوتا، اور کلاسکل لٹریچر کا گہرا مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے آج کل کے نوجوان شعراء کا کلام کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ عیب یہیں نہیں بلکہ ایران کے نوجوان شعراء میں بھی پایا جاتا ہے!

اسی کے ساتھ ایک بات اور عرض کر دوں، وہ یہ کہ نظم گو شعراء کے ساتھ تو خیر، کچھ رعایت بھی ہو سکتی ہے، لیکن غزل گو شاعروں کا فنی یا متغزلانہ خصوصیات سے ہٹ کر کچھ کہنا کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ غزل اچھی ہوگی یا بُری، اس کے درمیان کوئی اور درجہ نہیں، اس لئے وہ کہنہ مشق شعراء، جن میں اب اچھی غزل کہنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی، ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ غزل گوئی ترک کر دیں۔ ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے، اور ہر بات کا ایک موسم، اس لئے جب وہ عمر و موسم ختم ہو جائے، تو بے سُرا الاپنے سے خاموش رہنا ہی بہتر ہے!

(۲۷)

عرفی و نظیری —— گرامی عزیز! —— یہ معلوم کر کے کہ آپ عہد مغلیہ کی فارسی شاعری پر مقالہ مرتب کر رہے ہیں، کیا کہوں، کتنی مسرت ہوئی، میں اس باب میں آپ کی ہر ممکن مدد کے لئے آمادہ ہوں، گو آپ کو اس کی ضرورت نہیں، عرفی اور نظیری یقیناً بہت زیادہ قابل توجہ ہیں، آپ مجھ سے ان کے چند ایسے بہترین اشعار چاہتے ہیں جن سے ان دونوں کا رنگ متمایز ہو سکے، یہ بڑا مشکل کام ہے، لیکن ایک چیز عرفی کے یہاں زیادہ نمایاں ہے، 'جوشِ بیان' اس میں شک نہیں استدلال کی شاعرانہ قوت جذبات دونوں کے یہاں ہیں، لیکن عرفی کے یہاں تلخی اور گہرائی زیادہ ہے، اور نظیری کے یہاں سادگی، فتادگی اور معاملہ بندی۔ انداز بیان میں تیکھا پن، دونوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن عرفی کا تیکھا پن ذرا پیچیدگی لئے ہوئے ہوتا ہے اور نظیری کا شوخی سے آگے نہیں بڑھتا۔ ذکر آ گیا ہے تو کچھ مثالیں بھی پیش کر دوں۔

عرفی کے بعض مشہور اشعار جن سے اس کے جوشِ بیان اور قوتِ استدلال کا پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

عشق اگر مرد ست، مردے تاب دیدار آورد	ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد،

عارف ہم از اسلام خراب ست و ہم از کفر	پروانہ چراغ حرم و دیر نداند!،

گماں مبر کہ تو چوں بگزری جہاں بگزشت	ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

حدِ کنہ تو بہ ادراک نشاید دانست	ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من ست

بردہ پیالۂ خونیں بجز ز قصاباں!	مشو گدائے شباناں کہ شیر می دوشند

پہلے اور آخری شعر کو آپ اسی جوش کے ساتھ پڑھئے، جس جوش کے ساتھ عرفی نے انھیں کہا ہے تو آپ یقیناً ان میں تغزل کی کیفیت بالکل محسوس نہ کریں گے، بلکہ اس کو خطیبانہ شاعری میں جگہ دیں گے، جو نظیری کے یہاں بالکل نہیں پائی جاتی چوتھے شعر میں جوش نہیں ہے بلکہ محض ندرت بیان ہے، اور تغزل سے دور، لیکن نظیری جب اس قسم کے ندرتِ بیان سے کام لیتا ہے

تو اس کا رنگ تغزل اور زیادہ لطیف ہوجاتا ہے۔ مثلاً :-

گرچہ می دانم قسم خوردن بجانت خوب نیست
ہم بجانِ تو کہ یادم نیست سوگندِ دگر !

"ہم بجان تو" کہکر کس خوبی کے ساتھ اس نے "یادم نیست سوگندِ دگر" کا ثبوت پیش کیا ہے، اور کتنی ربودگی وفتادگی سے کام لیا ہے۔

عرفی کے دوسرے اور تیسرے شعر میں یقیناً غزل کی سادگی و بے ساختگی پائی جاتی ہے، لیکن عاشقانہ جذبات سے معرا ہے، برخلاف اس کے نظیری کا ایک شعر سنئے جو عرفی کے دوسرے شعر کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے !:-

دو نیم گشتہ دل از کفر و دیں، نمی دانم !
کزیں دو پارہ دل آید ترا بکار کدام !

کس درجہ لبریز جذبات ہے !

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عرفی کے یہاں عاشقانہ جذبات کی کمی ہے، لیکن ان کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں جذبات کے ساتھ جوش بھی ملا ہوا ہے۔ مثلاً :-

بیا اے عشق رسوائے جہانم کن کہ یک چندے
نصیحتہائے بیدرداں شنیدم آرزو دارم
نخورم زخم دراں کوچہ کہ مرہم باشد
نشوم کشتہ دراں شہر کہ ماتم باشد
تہنیت جز بر مصیبت در طریق ماست ننگ
عید را در شہر ما رسم مبارکباد نیست
ہر گاہ گفتہ ایم کہ عرفی اسیر کیست
آہ از نہادِ گبر و مسلماں بر آمدہ

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، عرفی کے جذباتِ عشق میں تلخی زیادہ ہے، اور اس کا ثبوت مذکورۂ بالا شعر سے مل سکتا ہے، دوسری قسم وہ ہے جس میں سادگی، فتادگی اور برشتگی بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اور عرفی کا یہی وہ رنگ ہے، جس میں اس کے اور نظیری کے درمیان امتیاز مشکل ہوجاتا ہے، مثلاً :-

خوش آں ساعت کہ می رفتی و طاقت می رمید از من
تغافل از تو می بارید و حسرت می چکید از من

امروز نگاہ من و عرفی بہم افتاد　　یا ہم نگرستیم، دگر ستیم و گزشتیم
تمام بود بیک حرف گرم و ما غافل　　حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند
گر کام دل بہ گریہ میسر شود ز دوست　　صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اب چند اشعار نظیری کے بھی اسی رنگ میں ملاحظہ ہوں :-

ازیک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود — امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

تو مپندار کہ ایں قصہ زخود می گویم — گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

تا منفعل ز رنجش بیجا ببینمش — می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

دل شکستہ دراں کوئے می کنند درست — چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

اگر آپ غور کریں گے تو باوجود تغزل کی یکرنگی کے دونوں کلام میں فرق نظر آئے گا، اور وہ غالباً وہی ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ عرفی کے یہاں تلخی جذبات زیادہ ہے اور نظیری کے تغزل میں روانی و سادگی کی فراوانی ہے۔

عرفی کے کلام میں چونکہ شکوہ الفاظ بھی زیادہ پایا جاتا ہے، جو پُر جوش طریق اظہار کے لئے ضروری ہے، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ عرفی قصاید میں جتنا کامیاب نظر آتا ہے، تغزل میں نہیں، اور نظیری صرف غزل کا شاعر تھا، اور تغزل کی تمام خصوصیات انتہائی خوبی کے ساتھ اس کے کلام میں پائی جاتی ہیں لیکن میری یہ رائے ایسی نہیں جس پر اعتماد کر کے آپ اپنی تحقیق و جستجو کا مرکز بدل دیں، ہو سکتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں، اور آپ زیادہ عمیق تحقیق کے بعد کسی اور نتیجہ پر پہونچیں!

(۲۸)

قدیم و جدید شاعری ——— مکرمی! — آپ لوگوں کے کہنے میں نہ آئیے اور خود غور کر کے کوئی فیصلہ فرمائیے! نہ قدیم شاعری میں تمام باتیں خراب تھیں، نہ جدید شاعری میں تمام باتیں اچھی ہیں! حیرت ہے، آپ کو ابہام تو پسند ہے، لیکن ایہام ناپسند۔ ایہام بھی دراصل وہی چیز ہے، جسے آپ حضرات "اشاریت" کہتے ہیں۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ "ابہام و اشاریت" کی انتہا اہمال ہے۔ اور ایہام کی "تکلف و تصنع" ——— !

جذبات الفاظ ہی سے ظاہر ہوتے ہیں، اور الفاظ ہی سے شعر بنتا ہے۔ اس لئے ان کی اہمیت سے انکار نہ کیجئے۔ رہی داخلی و خارجی کیفیت سو آپ دیکھیں گے کہ الفاظ کے الٹ پھیر اور ایہام سے بھی بڑے بڑے پاکیزہ اشعار پیدا ہوتے ہیں، نہ صرف اُردو میں بلکہ فارسی میں بھی۔

ان کو چھوڑئے جو ایہامی شاعری کرتے یا نہ کرتے، مگر شاعر کبھی نہ بن سکتے تھے، ان کو دیکھئے جو شاعر پیدا ہوئے تھے اور پھر ان کے خارجی رنگ پر غور کیجئے کہ اس میں کتنی داخلیت پنہاں تھی، کمال اسمٰعیل کا ایک شعر یاد آگیا۔ سنئے :-

بود ہمیشہ جانِ من، رسم تو بیگنہ کشی!

ہیچ نمی کشی مرا، من چہ گناہ کردہ ام!!

شاعر اس میں شک نہیں صرف لفظ گناہ سے کھیلا ہے، لیکن کس حسن معنویت کے ساتھ، آپ ہی انصاف کیجئے، اگر شعر کا آخری ٹکڑا۔ "من چہ گناہ کردہ ام" نکال دیجئے تو پورا شعر بیکار ہو جاتا ہے۔

الفاظ سے غالب بھی کھیلا ہے۔ لیکن کس انداز سے ملاحظہ ہو :-

شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم

نہ دیدنِ تو شنیدم، شنیدم بنگر

خسرو کا مشہور شعر ہے :-

می روی و گریہ می آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگزرد

عرفی کا شعر ہے :-

حد کنہ تو بہ ادراک نشاید دانست
ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من ست

صرف ایک لفظ ادراک پر شعر کی بنیاد قایم ہے، لیکن کس قدر عمیق معنویت کے ساتھ !
غالب کہتا ہے :-

فلک نہ دور رکھ اس سے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

شعر کی بنیاد محض درازدستی پر قایم ہے اور یکسر ایہام، لیکن غالب کے بہترین اشعار میں سے ایک یہ بھی مانا جاتا ہے۔ اگر آپ کی بے مزگی کا خیال نہ ہوتا، تو کچھ اور اشعار پیش کرتا !— بہرحال میں ایہام کی شاعری کو یقیناً پسند نہیں کرتا، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جب کسی شعر میں معنویت ہی ایہام سے پیدا ہوتی ہے تو پھر اس کا جواب بھی نہیں ہوتا۔ لیکن

ایں آتش نیرنگ نہ سوزد ہمہ کس را

بڑا مشکل کام ہے، بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے اور خاص فطری استعداد کی !

۲۹

غالب وتصوف —— غالب کی فارسی غزلوں میں وہ رنگِ تصوف تو بہت کم ہے جس کی آپ کو جستجو ہے۔ پھر بھی بعض اشعار ایسے مل جاتے ہیں، جو اصطلاحات تصوف سے علاقہ رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے خود ایک بار اس موضوع کو سامنے رکھ کر غالب کے کلام کا انتخاب کرنا چاہا تھا، لیکن اس کی تکمیل کا موقع نہ ملا۔ اب آپ نے اس کا ذکر کر کے پھر اس خیال کو تازہ کر دیا۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کہ غالب کی سب سے پہلی غزل جو اُس نے حمد و نعت میں لکھی ہے، اسی سلسلہ کی چیز ہے، اس کا پہلا شعر ہے :-

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا
باہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

یہ تو بے شک اس رنگ کا شعر ہے جس میں "ہمہ اوست" اور "ہمہ از دست" کا خیال اس نے پیش کیا ہے، لیکن باقی اشعار قصیدہ کے رنگ کے ہیں۔ اسی خیال کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو :-

قطرہ و موج و کف و گرداب، جیہون ست و بس
ایں من و مائ کہ می بالد حجابے بیش نیست

یہی فلسفہ ایک اور پہلو سے اس نے پیش کیا ہے، لیکن کس حسن کے ساتھ :-

ما ہماں عین خودیم، اما خود از وہم دوئی !
درمیانِ ما و غالب ما و غالب حایل ست

اس رنگ کے اشعار غالب کے یہاں بہت کم ہیں، لیکن اس سے زیادہ لطیف رنگ کا تصوف اس کے یہاں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مثلاً:-

شورے ست نوا ریزیِ تارِ نفسم را
پیدا نئی اے جنبشِ مضراب کجائی !
در ہجومِ ظلمت، از بس خویش را گم می کند
قطرہ در دریاست گوئی سایہ در شبہائے من

اس میں غالب نے بالکل نئی بات لکھی ہے۔ قطرہ و دریا کے تعلق کو اکثر شعراء نے ظاہر کیا ہے۔ لیکن تشبیہی صورت سے جس طرح غالب نے پیش کیا وہ بیدل کے سوا کہیں نہ ملے گا !

آپ نے اگر کوئی انتخاب اس موضوع کو سامنے رکھ کر کیا ہے تو بھیجدیجئے۔ دیکھنا چاہتا ہوں !

(۳۰)

نسبتی ـــــــ جناب من ! ـــــ قیامت ہے، آپ بھی اسی تنگ نظری کا شکار ہیں جس سے شبلی تک نہ بچ سکے۔ خیر بیدل کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے یہاں زبان کا لطف نہیں، کیونکہ اس کی شاعری زبان کی تھی ہی نہیں۔ لیکن نسبتی کا نام سن کر ناک بھوں چڑھانا محض اس بنا پر کہ اسے تھانیسر سے نسبت تھی۔ بڑا ظلم ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے اس کا کلام دیکھا ہی نہیں ورنہ آپ ایسا خوش ذوق و خوش فکر انسان ایسا نہ کہتا۔

نسبتی کی شاعری، محض تغزل کی شاعری ہے اور نہ صرف جذبات کی بلندی و پاکیزگی بلکہ زبان کی حلاوت اور طرز بیان کی خوبی و ندرت کے لحاظ سے بھی "قدر اول" کی چیز ہے۔ وہ عشق و محبت کے صحیح و پاکیزہ تاثرات کو ایسے لطیف و بے ساختہ انداز سے ظاہر کرتا ہے کہ سعدی اور خسرو دونوں بیک وقت ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ نسبتی کی آواز خود ہمارے دل کے اندر سے نکل رہی ہے۔

تذکروں میں اس کا نمونۂ کلام دو چار شعروں سے زیادہ نہیں پایا جاتا، شاید اس لئے کہ اس کا دیوان نایاب ہے، لیکن آپ تو ایسا نہ کہئے اس کا پورا دیوان آپ کی نگاہ سے گزر چکا ہے، حیران ہوں کہ آپ نے کس نگاہ سے کس عالم میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔

اگر ناگوار نہ ہو تو اس کے چند اشعار میں بھی حاضر کروں، ممکن ہے آپ کے نسخہ میں یہ نہ پائے جاتے ہوں ! زبان کی حلاوت و سادگی اور بیان کی شگفتگی و روانی ملاحظہ ہو:-

بگزار تا دمے ز شکایت تہی کنم ـــ در سینہ می خلد گلۂ ناتمامِ ما
اے آنکہ بیغمانہ روی از کنارِ ما ـــ آگاہ نیستی مگر از انتظارِ ما

جوش و خروش ـــــ گرد از سر کوئے یار برخاست ـــ آہے زدم و غبار برخاست

از خونِ دلم شیشۂ مے زہر بجام ست ـــ بر حوصلۂ جامِ جم ایں بادہ حرام ست
ہجرش از آب می برآید دُود ـــ وصلش از شعلہ می چکاند آب
ما از دل و از کام دل خویش گزشتیم ـــ امروز اجابت نتواں داشت دعا را

اشک ریزاں می روم در وادیِ آوارگی — تا کجا خواہم فشردِ این دامنِ نمناک را

محبت کی تلخکامی —— تو اے جاں در نمی آئی، دل از جا در نمی آید — کسے تا چند بر باد اردِ این آرام و تسکیں را

نے وعدہ، نے امید، تو خود گو جواب چیست — پرسند گر ز ما سببِ انتظارِ ما

چارہ نتواں کرد دردِ کہنہ و دیرینہ را — دست بر دل می نہادم پارہ کردم سینہ را

در دلِ سنگینِ آں بیرحم تاثیرے نکرد — نسبتیؔ بر گریۂ خود خندہ می آید مرا

ما نسبتیؔ از بزم طرب بخت نداریم — تہمت بہ خم و بادہ و ساغر نتواں بست

پیوندِ دل از ہمہ بریدیم! ! — دیرے ست کہ خاطرم بجا نیست !

نسبتیؔ یک جرم را صد عذرِ گفت — گرچہ تقصیرے کہ می باید، نداشت !

سپردگیِ عشق —— سرِ من گر بودت ورنہ بود رنجش نیست — چہ تواں کرد مرا با تو سرے افتادست

مُردیم و بود در دلِ حرفے کہ با تو گویم — در خاک رفت با ما رازِ نہانیِ ما

از روز و شب نسبتیؔ احوال چہ پرسی — ہر صبح گرفتارِ تو، ہر شام اسیرست

محاورہ و زبان —— بدنامیِ تازہ برانگیخت دستِ گرد — طشتے دگر فتادہ ہمانا ز بامِ ما

بزمِ جم آخر شد وقتِ صبوحِ ما رسید — طرحِ دیگری تواں انداخت دورِ جامِ ما

در ہر کہ بنگرد و غلطِ یار می خورد — چشمِ خطا نظارہ ندانم چہ دیدہ است

گُل ہمہ گوش ست لیکن صوتِ بلبل نارساست — نالہا کوتاہ افتادست، جرمِ گوش نیست

پیوندِ دل از ہمہ بُریدیم، — دیرے ست کہ خاطرم بجا نیست

موقوف بہ خنجرِ دگر شد — آسایشِ نیم بسملِ ما !

شوخی و حُسنِ تعبیر —— در نسخۂ نسبتیؔ ست یک نام — عنقا و وفا کیمیا را !

قرباں شوم ابروِ بتاں را — زورِ دگر ست این کماں را

ورائے عشوہ و ناز و خرامِ رعنائی — دگر ہزار بلا ہمرہ ست بالا را

نمود وعدۂ قتلم دو چشمِ او لیکن — چہ اعتماد تواں کرد قولِ مستاں را

(۳۱)

فسانہ نگاری —— حضرت! خط ملا، اور ساتھ ہی ساتھ فسانہ بھی، پڑھا اور بہت خوش ہوا۔ لیکن بُرا نہ مانیے تو عرض کروں کہ اب ہماری آپ کی فسانہ نگاری کا دور ختم ہو چکا ہے —— پچھلے چند سال کے اندر جو انقلاب اس فن میں ہوا ہے اس کو نبھانے کے لئے جس آزادہ روی اور کھل کھیلنے کی ضرورت ہے، وہ ہمیں آپ کو نصیب نہیں! —— اس سے قبل فسانہ نگاری نام تھا صرف خیال سے لذت اندوز ہونے کا، لیکن اب وہ عملی زندگی کی چیز ہے۔ پہلے صرف تصور سے کام چل جاتا تھا جس کے لئے مخصوص فرصت درکار تھی اور اب معاملہ "حقایق" کا ہے جن کے لئے خاک چھاننا ضروری ہے پھر اب "خاک بسر" رہنے کا زمانہ ہمارے آپ کے لئے کہاں؟ جو بساط آپ الٹ چکے ہیں، اس کو اپنے حال پر رہنے دیجئے، مکرر رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں۔ "صنادید" کی عظمت ان کی کہنگی ہی میں ہے —— "تاج محل" کبھی ڈرائنگ روم نہیں بن سکتا!۔

(۳۲)

امیر اللہ تسلیم ——— عرفی کا شعر ہے :-

مرا فریب دہد نالہ و بہ غمم گوید
ز من ترانہ شنو با اثر چہ کار مرا

آپ کو معلوم ہے کہ محبت کی کس منزل کی طرف اس میں اشارہ ہے ؟ یاس و ناامیدی کی وہ آخری حد جب محبت کرنے والا اپنے آپ کو فریب دینا چاہتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں فریب دے رہا ہوں۔ لیکن ایک منزل اس سے آگے اور بھی ہے جب اس احساس کے بعد یک لخت خاموشی شروع ہو جاتی ہے سو میں آپ کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اس تحریر کے بعد ہی میں اس منزل میں قدم رکھنے والا ہوں "من و تو" کا جھگڑا انتہائے قرب نہیں بلکہ انتہائے بعد و ہجراں کی صورت میں ہمیشہ کے لئے مٹ جاتا ہے۔ آپ ایک امر کا عزم فرماتے ہیں۔ میں اسے پسند نہیں کرتا، اس کے بعد آپ کا اصرار شروع ہوتا ہے اور میں صرف اس لئے کہ آپ کی دلآزاری نہ ہو، کہہ دیتا ہوں۔ "خیر آپ کی مرضی" دو مہینے اس طرف کی بات ہے۔ اس کے بعد اشارۃً و کنایتاً یاددہانی کرتا ہوں، کوئی جواب نہیں ملتا، صراحتہً تقاضہ کرتا ہوں، آپ خاموش رہتے ہیں، طعن و تشنیع پر اُتر آتا ہوں، آپ ٹال جاتے ہیں۔ یہ آخر کیا وضع ہے ؟

سچ کہتے ہو، میں قدامت پسند ہوں۔ میر و درد، نسیم و مصحفی، مومن و غالب کی یاد میرے دل سے کسی طرح نہیں نکلتی۔ ہاں میں نے منشی امیر اللہ تسلیم کو دیکھا ہے ان سے ملا بھی ہوں اور ان کی شاعری کا بھی معترف ہوں، میرا عنفوان شباب ہے اور ان کا زمانۂ شیب، یعنی میری مسیں بھیگ رہی ہیں اور وہ "دورِ پرافشانی" سے گزر رہے ہیں۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر جھریوں کا یہ عالم جیسے کپڑے پر اتو کر دیا ہو، یہ ہے ان کی ہیئت کذائی ! بغیر عصا کے سہارے کے ایک قدم چلنا دشوار، سماعت اور بینائی تقریباً مفقود، کمر جھکی ہوئی، ریش و بروت سب برف کے گالے کی طرح سفید، ہاتھ پاؤں میں رعشہ، لیکن خوشدلی اور خوش مزاجی کا یہ عالم کہ گویا جوانی ابھی آئی ہے۔

رام پور میں بزمرۂ خوش نویسان ملازم تھے، تیس روپیہ مشاہرہ تھا، لیکن خدمت معاف تھی، جوانی کے زمانہ میں کسی خوشرو پنجابی لڑکے سے محبت تھی جو اب خود بھی ضعیف ہو گیا تھا، لیکن وضعداری کا یہ عالم تھا کہ شام کو مغرب سے قبل روزانہ عصا ٹیکتے ہوئے گھر سے چل کر اس دوکان پر آ کر ایک گھنٹہ بیٹھنا ضرور۔ جامع مسجد کے قریب اس کی دوکان تھی، مغرب کی اذان ہوتے ہی مسجد چلے جاتے اور یہاں سے پھر وہ عشاء کی نماز پڑھ کر گھر واپس آتے، جب تک ان میں سکت رہی، ان کا یہ معمول ترک نہیں ہوا، کیا بتاؤں کس قدر دلچسپ انسان تھے، بچوں میں بچے۔ جوانوں میں جوان اور بوڑھے تو خیر وہ تھے ہی۔ سو سے ایک دو سال کم

لکھنؤ سے کئی ماہ کے بعد واپس آئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لکھنؤ میں سخت طاعون پھیلا تھا اور شاید اس میں مبتلا بھی ہو چکے تھے۔ کسی نے پوچھا حضرت اس مرتبہ وطن میں بہت قیام رہا، فرمانے لگے "ہاں میاں گیا تو اسی ارادہ سے تھا کہ اب واپس نہ آؤں گا، اور حضرت طاعون سے التجا کروں گا کہ میری مشکل بھی آسان کر دیجئے، لیکن وہاں وہ اس قدر مصروف تھے کہ میری بات بھی نہ پوچھی، مجبوراً واپس آ گیا۔ اب ارادہ ہے کہ دو سیکڑہ پورا ہی کر لوں " کہنے والے نے کہا "حضرت اس کے بعد پھر اکائی شروع ہوتی ہے

فرمایا کہ :- "پھر جینا بے حیائی ہے"۔

ایک بار مشاعرہ میں بھی دیکھا تھا۔ نواب مرحوم کو نیا نیا ذوق مشاعرہ کا ہوا تھا اور کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا منشی امیر اللہ تسلیم کی نوبت آئی تو عصا ٹیک کر کھڑے ہوگئے اور غزل کسی اور نے پڑھنا شروع کی، نواب ان کے اشعار کی داد دیتے تھے جو لوگ ان کے کان کے پاس منھ لیجاکر زور سے چیخ چیخ کر کہتے کہ "سرکار آپ کے کلام کی داد دے رہے ہیں"۔ وہ جھک جھک کر آداب بجالاتے تھے۔

مثنوی لکھنے میں ان کو کمال حاصل تھا اور کہنہ مشقی کا یہ عالم کہ نواب کی سیاحت یورپ کے متعلق جو سرکاری بیانات رامپور پہونچتے تھے انھیں وہ اسی وقت نظم کر دیا کرتے تھے، چنانچہ جب واپس آئے تو انھوں نے یہ مثنوی مولوی فرخی صاحب کے ذریعہ (جو نواب کے استاد تھے) پیش بھی کی۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کو کوئی صلہ نہ ملا۔ بعض کا خیال ہے کہ مولوی فرخی نے اسے پیش ہی نہیں کیا کیونکہ وہ خود سفرنامہ مرتب کر رہے تھے (جو بعد کو سیر حامدی کے نام سے شایع ہوں۔ بہر حال ان کی آخر عمر کا کارنامہ یہ مثنوی ہے جو ممکن ہے اب بھی رام پور میں تلاش سے دستیاب ہو جائے۔

غزل گوئی میں چونکہ یہ خاندان مومن سے تعلق رکھتے تھے اس لئے باوجود لکھنوی ہونے کے ان میں لکھنویت بہت کم تھی۔ جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ مومن کی ہلکی ہلکی فارسی ترکیبوں کا بانکپن ان کے کلام کی بھی خصوصیت تھی۔ ایک بار میں نے خود انکی زبان سے ایک غزل سنی تھی، دو تین شعر اب بھی یاد ہیں :-

جی میں آتا ہے کہ اکدن مر کے ہم	ہمتِ دوشِ عزیزاں دیکھ لیں
التفاتِ جوشِ وحشت پھر کہاں	ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں
گر انھیں ہے خوفِ عرضِ آرزو	دور سے حالِ پریشاں دیکھ لیں

مگر تمھیں یہ کیوں پسند آنے لگے، تم ٹھہرے مرد صوفی، جب تک مسئلۂ وحدت الوجود درمیان نہ آئے اور اس کو فلسفہ کہکر مہمل طور پر پیش نہ کیا جائے، تمھارے نزدیک شعر ہی کیا۔

تم غریب تسلیم کی روح کو کیوں بےچین کرو گے۔ تمھیں تغزل سے کیا واسطہ، تم کیا جانو کہ مومن کی بازاری شاعری کیا چیز تھی تم فراق پر لکھو، ناسخ کی تعریف کرو، خواجہ وزیر کے کلام کو بیتیں کرو۔ اور تسلیم وغیرہ کو ہم ایسے قدامت پرستوں کے لئے چھوڑ دو۔ مجھے تو اس بات کا اندیشہ نہیں کہ تمھاری صوفیانہ شاعری کی توہین کرکے حور و قصور سے محروم ہو جاؤں گا، لیکن تم البتہ میرد مومن کی بُرائی کو نجات کے لئے ضروری قرار دیتے ہو اس لئے جانتا ہوں کہ فیصلہ دشوار ہے۔

بہر حال تسلیم کے متعلق جو کچھ میری ذاتی رائے تھی وہ لکھ دی ہے، کیا کوئی کتاب لکھ رہے ہو؟

(۳۳)

ذکرِ غالب —— میرے عزیز دوست —— آپ نے جس جوش محبت سے میرا حال پوچھا ہے، اس کا اقتضاء تو یہی تھا کہ میں واقعی تباہ حال ہوتا اور درخورِ التفات رہتا۔ لیکن افسوس ہے کہ زندہ ہوں، خوش ہوں اور ایسی پرسکون زندگی بسر کر رہا ہوں کہ :-

تو گوئی موجے از دریائے نور ست

یہ تو میں نے اس لئے لکھدیا کہ اگر آپ یہ تحریر کسی اور کو دکھائیں تو اس کو مجھ پر رشک آجائے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دُنیا میں اب میرا اتنا حصہ بھی نہیں ہے جتنا آپ کا عقبیٰ ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ آپ اس منزل پر پہونچے ہیں "اسباب بادہ نوشی" کی فراوانی ہے اور میں اپنی "تشنہ لبی و بے سرو سامانی" سے، آپ ہی بتائیے کہ یہ روز کی جگر کاوی یہ سد رمق سے زیادہ کبھی نہ بڑھنے والی آسودگی اور اس کو بھی جانے دیجئے۔ "یکساں شام و سحر" آخر ہے کیا؟ اس میں کیا لطف ہے کہ کوئی شخص جینے کی تمنا کرے۔

ہائے غالب! جب اس سے محشر میں باز پرس ہوئی کہ یہ جو تو نے ساری عمر سیاہکاری میں بسر کردی، تو اس سے کیا ملا اس نے جواب دیا کہ میں کچھ نہیں جانتا، مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ اگر میں ساری عمر روزہ و نماز میں بسر کر دیتا تو بھی آپ کیا دیتے زیادہ سے زیادہ یہی کرتے نا کہ فردوس عنایت کر دیتے لیکن آپ ہی بتائیے کہ مجھے وہاں کیا خاک لطف آتا۔

صبوحی خورم گر شراب طہور — کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبر دیہاے مستانہ کو — بہ ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجایش شورشِ نائے و نوش
سیہ مستی ابر باراں کجا — خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

نظر بازی و ذوقِ دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو؟
نہ چشم آرزو مندِ دلائے — نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ

رہ گئی حور، سو اس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ :-

گریزد دم بوسہ انیش کجا — فریبد بہ سوگند دنیش کجا

یعنی جنت میں شراب ملی بھی تو کیا نہ وہاں شور نوشا نوش ہے، نہ رندوں کا جوش و خروش نہ گھٹاؤں کا لطف ہے نہ باد نسیم کے جھونکوں کا مزہ نہ چھاتک "تانک کا موقعہ ہے نہ کسی کی صدائے قلقل کا انتظار، رہ گئی حور سو اپنے معشوق کو لے کر کیا کروں جو نہ جھوٹی قسم کھانا جانتی ہو اور نہ دست و درازی کے وقت بدن چرانا، جسے نہ اظہار مدعا پر گالیاں دینا معلوم ہو اور نہ انداز سپردگی میں کسی خواہش لطف کا احساس۔ سنا آپ نے یہ ہے تمام عمر کے زہد و اتقا کا نتیجہ۔ فردوس یا بقول غالب کے ایک پاک میخانہ!۔ تو پھر آپ ہی بتائیے کہ اس دُنیا میں جب کہ زندگی نام صرف ایک باقاعدہ مشین کی سی گردش کا ہو جینے کے کیا معنی ہیں جس آئندہ توقع پر یہ سب کچھ گوارا ہو سکتا تھا اس کا حال بھی آپ نے سُن لیا۔

(۳۴)

شاعرانہ تعبیر ـــــ کرم گسترا ـــ گرامی نامہ ملا۔ معاف فرمائیے جواب غیر معمولی تعویق سے جا رہا ہے۔ سبب نہ پوچھئے۔ یوں ہی کچھ بیہودہ سی اُلجھنیں تھیں۔

بے شک اُردو فارسی میں بات کرنے کو "پھول جھڑنے" سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں کہ فارسی میں اس کے علاوہ اور کوئی تعبیر نظر نہیں آتی۔ سعدی کا شعر ملاحظہ ہو:-

لبت بدیدم و لعلم، بیوفتاد از چشم!
سخن بگفتی و قیمت برفت لولو را!

علاوہ اس کے فارسی کا یہ مشہور فقرہ آپ نے سنا ہوگا "خوش گفتی در سفتی" الغرض بات کے لئے "گل افشانی" اور "گوہرافشانی" دونوں استعمال کئے جاتے ہیں۔ آپ اُردو میں بلاتکلف اس خیال کو ادا کر سکتے ہیں، اس کا تعلق محاورہ سے نہیں بلکہ استعارہ سے ہے۔ امسال ستمبر میں دارجلنگ جانے کا ارادہ ہے یا پھر بقدرِ علم زیادہ سے زیادہ "شملہ"

(۳۵)

فارسی ادب —— محترم —— اس میں کلام نہیں کہ بغیر فارسی لٹریچر کا مطالعہ کئے ہوئے اُردو لکھنا پڑھنا نہیں آسکتا۔ میں دبی زبان سے اس میں عربی کا بھی اضافہ کردوں گا، کیونکہ فارسی ادب کے محاسن کو سمجھنا بہت کچھ موقوف ہے عربی جاننے پر۔ آپ کے اس ذوق سے میں بے خبر نہ تھا لیکن وہ شغف کی حیثیت اختیار کرلے گا اس سے یقیناً بے خبر تھا۔ آپ کا وجدان صحیح خود بہتر رہنما ہے، مجھ سے یا کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں، لیکن چونکہ آپ نے دریافت کیا ہے اس لئے عرض کروں گا کہ آپ فی الحال سوا غالب کے کسی اور طرف توجہ نہ فرمایئے۔

جس ندرت اور شوخی پر آپ جان دیتے ہیں وہ سوا غالب کے کہیں نہ ملے گی اور پھر اسی کے ساتھ "فارسیت" کا وہ عالم کہ ہر صفحہ "ایران زار" نظر آتا ہے، نزاکت خیال اس میں شک نہیں کہ بیدل کا حصہ ہے لیکن اس میں یہ لطفِ زبان کہاں؟

جب تک آپ جوان ہیں "خرابات غالب" نہ چھوڑئے، انحطاط عمر میں البتہ "مصحف بیدل" سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ میری نہ کہئے، یہاں ہر بات اُلٹی ہے۔ جب جوان تھا تو بیدل پر جان دیتا تھا، اب زمانۂ انحطاط میں غالب پر سر دھنتا ہوں، اس سے یہ نتیجہ نکالئے گا کہ مجھ پر بڑھاپے میں دوبارہ جوانی آئی ہے، بلکہ یہ کہ میں جوانی میں بھی بوڑھا تھا۔

(۳۶)

غالب کا ایک شعر —— مکرمی —— نوازش نامہ پہونچا، آپ نے غالب کے شعر پر جس لطیف پیرایہ میں اظہار خیال فرمایا ہے، اس کی داد نہ دینا ظلم ہے گو بعض جگہ آپ کی غیر معمولی ذہانت کے اعتبار سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔

موسم دیر غنودن پہ شبستاں آمد

اس مصرعہ میں غنودن (بہ فتح غین ہو) یا غُنودن (بہ ضم غین) ایک ہی بات ہے، معناً تھوڑا سا فرق ان میں ضرور پایا جاتا ہے، یعنی غنودن، مطلق محو خواب ہونے کے معنے میں آتا ہے اور غُنودن آرام سے پڑے رہنے کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے شبستان سے مراد صرف خواب گاہ ہے، اس میں کسی اور پوشیدہ نسبت و اضافت کے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب رہا یہ کہ، "موسم دیر غنودن" سے کون سا موسم مراد ہے سو اس خاص موقعہ پر "مے و معشوق" وغیرہ کی رعایت کا کوئی سوال نہیں، کیونکہ اس قصیدہ کا پہلا ہی شعر:-

عید اضحیٰ بہ سر آغاز زمستاں آمد
وقت آراستن حجرہ و ایواں آمد

صاف بتا رہا ہے کہ کس موسم کا ذکر ہے علاوہ اس کے "موسم دیر غنودن" والے شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی صراحت موجود ہے کہ دن گھٹنے لگا ہے اور رات بڑھنے لگی ہے۔

اسی لئے میں نے عرض کیا کہ یہ شعر آپ کی بڑھی ہوئی ذہانت کا متحمل نہیں۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

(۴۷)

واہ اشعار ـــــ جانِ نیاز ـــــ یہ کیا ظلم ہے جو مجھ پر ڈھایا جا رہا ہے، آپ باوجود مجبور ہونے کے اس قدر آزاد کہ جس وقت جو جی میں آیا کہدیا، اور میں باوصف آزاد ہونے کے اتنا مجبور کہ آج جو تحریر آپ کی ملی ہے اس کا جواب نگار ہی کے ذریعہ سے دے سکتا ہوں۔ آپ ہی کا لکھا ہوا مصرعہ دہرانا پڑتا ہے کہ:-

چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنار ما بہ کنار ما

یہ "الٹی میٹم" آپ نے کس کو دیا ہے۔ انھیں کو نا "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"۔

آپ کی غزل کی داد کیا دے سکتا ہوں:-

نظر کو تاب تماشائے حسنِ یار کہاں

آپ کے دو شعر کبھی نہیں بھول سکتا:-

امید تیرا برا ہو ڈبو دیا تو نے ـــ دئے ہیں آخری دم تک فریب ساحل کے

تمام رات تصور میں گفتگو ان سے ـــ تمام رات فسانے تباہی دل کے

جس وقت یہ تحریر آپ کی نگاہ سے گزرے گی، میں حیدر آباد میں ہوں گا اور غالباً اخیر مارچ تک وہیں رہوں گا، اگر آپ اس دوران میں اپنا ترکش کچھ اور خالی کرنا چاہیں تو "امپریل پوسٹ آفس" کے ذریعہ سے۔

بردست دپائے بندہ گرانے نہادہ

نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادہ

(۴۸)

غالب کا بہترین شعر ـــــ بندہ نواز ـــــ بڑا مشکل سوال ہے۔ میں کیا اگر آپ خود غالب سے پوچھتے کہ اس کا بہترین شعر کون سا ہے تو وہ بھی اسکا جواب نہ دے سکتا۔ کیفیات کے ساتھ پسندیدگی کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس وقت مجھے اس کا یہ شعر اچھا معلوم ہو:-

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی ـــ منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

لیکن دوسرے وقت میں اس شعر پر جھوم رہا ہوں:-

ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب کب تلک

آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

لیکن اگر آپ یہ پوچھیں کہ اس کا بدترین شعر کون ہے تو بے شک میں بتا سکتا ہوں اور وہ یہ ہے:-

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے ـــ بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے

حُسن میں جتنا تنوع ہے قبح میں نہیں ہے، محبت کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں لیکن "نفرت" ایک ہی ہے خوبصورتی میں نگاہ کے مختلف زاویوں کی گنجایش ہے، لیکن بدصورتی میں صرف ایک کی۔ اس لئے بدترین کی تعیین اتنی دشوار نہیں جتنی بہترین کی ہے۔ اگر آپ نے ایسا شعر انتخاب کیا ہو تو میں بھی سننا چاہتا ہوں۔

(۳۹)

ہمارے مزاح نگار ——— صدیق محترم ۔ اُردو لٹریچر میں ہیومر (HUMOUR) کہاں اور بھی کیسے سکتا ہے ——— جس دور سے ہندوستان اس وقت گزر رہا ہے وہ مرثیہ کا طلبگار ہے نہ کہ ہو حق کا۔ اس وقت اُردو کے جتنے مزاحیہ نگار ہیں ان سب میں اس چیز کا فقدان ہے جسے فطری آمد کہتے ہیں۔ جو مضمون اٹھا کر دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ محض ہنسانے کے لئے خاص اہتمام کیا جا رہا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات غصہ آجاتا ہے۔ لٹریچر میں مزاح اسوقت پیدا ہوتا ہے جب اقتصادی زور انتہائی عروج پر پہونچ جائے اور یہ سب عروج و تمدن کی باتیں ہیں۔ آزادی کی برکتیں ہیں۔ اقتصادی بے فکری کے کھیل ہیں۔ سو بتائیے، ان میں کون سی چیز ہمیں حاصل ہے۔ خالی خوبی ہنسنا، کھسیانا پن کہلاتا ہے۔ اس لئے بجائے مزاح کے "زہر خند" قسم کا لٹریچر اختیار کیجئے تو زیادہ موزوں ہے، لیکن اس "طعنہ تا یافت" کا نباہنا زیادہ مشکل ہے۔

سوا ایک دو کے ہمارے یہاں جتنے مزاحیہ نگار ہیں ان سب کی حیثیت ان نقالوں کی سی ہے کہ اگر کسی محفل میں ان کی شکم پُری نہ ہوئی تو اہل محفل ہی کو گالیاں سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ان کو یہ سمجھانا آسان نہیں کہ دریدہ دہنی اور مزاح میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

علاوہ اس کے یہ رنگ وہی شخص کامیابی کے ساتھ نباہ سکتا ہے جس کا مطالعہ بہت وسیع اور ذوق ہمہ گیر ہو۔ پھر غور کیجئے کہ اس سلسلہ میں آپ کس کس کا نام لے سکتے ہیں۔ ایک صاحب جن کے آپ بھی معترف ہیں اور میں بھی، محض اس وجہ سے کوئی ترقی نہ کر سکے کہ انھیں مطالعہ سے نفرت ہے۔ عنفوانِ شباب میں اکثر حصہ وقت کا "طرحداریوں" کی رعایت میں صرف ہوا اور اب اس کی سوگواری سے فرصت نہیں۔ فطرت نے تو ضرور فیاضی سے کام لیا تھا، لیکن خود انھوں نے اس کی کوئی قدر نہ کی، اور قدر کیا نہیں کی میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ زمانہ ہی نے اس کا موقع نہ دیا۔

بہرحال آپ اس موضوع پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو لکھئے لیکن زمین بنجر ہے کاوش سے کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا۔

میں بعض مضامین کے سلسلہ میں نام بنام اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں، نگاہ سے گزری ہوگی، میں اب بھی اسی پر قایم ہوں اور اس میں کسی تغیر و تبدل کی گنجایش نہیں پاتا۔ اگر آپ واقعی سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں تو میری رائے میں سب سے پہلے لکھنؤ کے اس دور کو لیجئے جس نے سرشار اور سجاد حسین پیدا کئے کافی مسالہ ہاتھ آجائے گا اور پھر اس کی ارتقائی یا انحطاطی منزل پر بحث کیجئے۔

اس دور میں پنجاب میں ایک شخص پطرس پیدا ہوا تھا جس میں بڑی صلاحیت پائی جاتی تھی لیکن افسوس کہ اب وہ پطرس نہیں رہا، بخاری ہو گیا ہے، عبدالعزیز فلک پیما اب بھی زندہ ہے اور میرے نزدیک وہ ہندوستان کا بہترین مزاحیہ نگار ہے یوپی نے صرف ایک شخص محفوظ علی پیدا کیا لیکن وہ بھی دولت مستعجل ثابت ہوا، رشید احمد البتہ گھسٹے چلے جا رہے ہیں،

ان کے علاوہ یہاں کوئی قابل ذکر نہیں، سب تیسرے اور چوتھے درجہ کے لکھنے والے ہیں کوئی دوسرے درجہ کا بھی نہیں۔

اس وقت طبیعت حاضر نہیں، ورنہ شاید کچھ اور کہہ سکتا۔

(۴۰)

ذکر اقبالؔ ـــــــ مخلص نواز ـــ آپ کیا پوچھتے ہیں، یہ حادثہ کتنا بڑا ہے۔ میں دوپہر کو حسب معمول اپنے کام میں معروف تھا کہ ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کے ایک عہدہ دار تشریف لائے اور کہا کہ "اقبالؔ کا انتقال ہوگیا ہے اور شام کو ریڈیو اسٹیشن پر آپ کو اس حادثہ کے متعلق ایک تقریر نشر کرنا ہے۔" میری عمر میں بہت کم واقعات ایسے ہیں جنھوں نے مجھے اچانک صدمہ پہونچایا ہو سنتے ہی دماغ چکرانے لگا، پیشانی پر پسینہ آگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے تیز روشنی گل کرکے دفعتاً اندھیرے میں ڈال دیا ہے۔

میں مرحوم سے اول اول سنہ ء میں ملا تھا اور وہیں لاہور میں۔ ملاقات بہت مختصر تھی، لیکن تاثرات کے لحاظ سے بہت کامیاب، اس کے بعد بھی چونکہ عرصہ تک میرا قیام لاہور میں رہا اس لئے بارہا حاضری کی فرصت نصیب ہوئی اور ہر مرتبہ انکی شاعرانہ عظمت ایک نئے انداز سے میرے دل میں گھر کرتی گئی۔

آپ "صدیاں" کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ جگہ کبھی پُر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے پہلے کب کسی کی جگہ پر ہوئی ہے کہ اب ہوگی سعدیؔ، ہومرؔ، شیکسپیرؔ، فردوسیؔ، بیدلؔ ہمیشہ ایک ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ سے زیادہ شہرت وقبول کسی اور شاعر کو نصیب ہو جائے لیکن اقبالؔ کی جگہ بدستور خالی نظر آئے گی۔ میں نے نگار میں اس حادثہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا، کیونکہ رسمی باتوں سے مجھے نفرت ہے اور اقبالؔ کے لئے حقیقی معنی میں صفِ ماتم بچھانے کے لئے کافی وقت اور کافی کاوش کی ضرورت ہے۔ پھر یہ کہ اقبالؔ پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ میں چاہوں بھی تو کوئی اضافہ اس میں نہیں کر سکتا۔

اقبالؔ کا پیام جو کچھ بھی رہا ہو اس سے بحث نہیں لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ کہتا کس زبان میں تھا، اس کی شاعرانہ خصوصیات میں رفتہ رفتہ جو ترقیاں ہوئیں وہ ثبوت ہیں اس امر کا کہ اس کی شاعری یکسر مفکرانہ تھی، جسے دوسرے الفاظ میں ملہمانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اقبالؔ کی موت کو دنیا "بے وقت" کہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "ضرب کلیم" کے بعد ان کو زندہ نہ رہنا چاہئے تھا، زندگی کا مقصود پورا ہو جانے کے بعد مرنا نہ جینا برابر ہے۔

بہت سے رسالے اقبالؔ نمبر نکال رہے ہیں اور نکالیں گے، لیکن مجھ میں ہمت نہیں، مجھے سوگواریاں خاموش ہی زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

(۴۱)

جلال اسیرؔ ـــــــ مکرمی ـــ جلال اسیرؔ بہت اچھا شاعر تھا اور عرفیؔ، نظیریؔ اور کلیمؔ کی صف میں لایا جا سکتا ہے غالبؔ کو انھیں چاروں کا نچوڑ سمجھئے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

برنمی آید دلم با روزگار　　شیشۂ طاقت بہ سنداں می زنم

سینہ صافی، باغ من، بستان من　　خندہ بر الفت پرستاں می زنم

مسلماں کافرم، کافر مسلماں　　نہ دینم رونقے دارد نہ دُنیا

اسیر از دوست پرسیدن چہ حاجت سوائے را کہ دشنامش جواب ست
دل را در آتش افگنم و بوئے او کنم منت نمی تواں ز نسیم و صبا کشید
از غبارِ شوق طرح کعبۂ دل ریختند گردِ رہ برداشتند و رنگ منزل ریختند
شمع را بہر دِ بلبل کرد عشق برگ گل چید و پر پروانہ ساخت
در گلستاں دیدمش نشناختم بر تنش پیراہنِ گل تنگ بود

لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس قسم کے اشعار جلال اسیر کے یہاں کم ہیں اور اسی لئے نہ وہ عرفی و نظیری کا ہمسر ہو سکا اور نہ ہم غالب پر اسے ترجیح دے سکتے ہیں۔

(۴۴)

بیدل ——— مکرمی ——— خیال نہایت پاکیزہ اور اچھوتا ہے، بلبل و آشیاں، برق و گلچیں پر بہت توجہ صرف کی گئی، اور لوگوں نے ڈھونڈھ کر ایسے اشعار کو جمع بھی کیا، لیکن "آئینہ" کے متعلق کوئی صورت کاوش کی اختیار نہیں کی گئی۔

بے شک حیرانی کا تلازمہ تو باقی رہے گا، لیکن اس میں بھی بات پیدا کرنے والے پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ یہ موضوع بیدل کو بہت پسند تھا۔ اس سے بہتر اشعار آپ کو کسی اور جگہ نہ ملیں گے۔ اس وقت دو شعر یاد آ گئے ہیں انھیں تو سن ہی لیجئے:۔

یار در آغوش و نام او نمی دانم کہ چیست سادگی ختم ست چوں آئینہ بر نسیانِ ما
بدل نقشے نمی بندد کہ با وحشت نہ پیوندد نمی دانم کہ امیں بے وفا آئینہ چید اینجا

(۴۳)

ایہام اور غالب ——— عزیز گرامی ——— اس میں شک نہیں "ناسخ" کا وجود شاعری میں ایک مرض متعدی کی حیثیت رکھتا تھا، جو صرف لکھنؤ تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس نے دہلی کو بھی تباہ کیا، یقیناً شاہ نصیر اور ذوق کے علاوہ اور شعراء نے بھی اس طلسم بندی کو اختیار کیا، لیکن غالب کو اس درمیان میں نہ لائیے تو بہتر ہے، آپ کو معلوم ہے کہ لکھنوی شاعری کا وہ رنگ جس نے حد سے گزر کر اسے معیوب بنا دیا اس کا "ایہام" تھا۔ ایک لفظ اگر محل استعمال کے لحاظ سے مختلف معانی دیتا ہے تو وہ نہایت بے تکلفی سے ان سب کو ملحوظ کر دیتے تھے اور یہ بات ضلع جگت سے پیدا ہوئی تھی۔

امیر مینائی کا مشہور شعر ہے:۔

انگور میں یہ سے تھی پانی کی چار بوندیں پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

چونکہ کھنچنا شراب کے لئے بھی مستعمل ہے اور تلوار کے لئے بھی، اس لئے شاعر نے بلا تکلف شراب کو تلوار کہہ دیا۔ اس قسم کی لفظی "وجہ شبہ" یقیناً نہایت مکروہ چیز ہے۔

غالب کے یہاں تلاش سے آپ کو شاید دس پانچ ہی شعر اس رنگ کے ملیں۔ مثلاً:۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہئے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

چونکہ لفظ دم سانس کے معنی میں بھی آتا ہے اس لئے اس کے لئے سینۂ شمشیر بھی پیدا کر دیا اور دم کا باہر آنا بھی لکھ دیا حالانکہ "دم شمشیر" کا جس سے مراد "تیزی شمشیر" ہے سینۂ شمشیر سے باہر آنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی انداز کا ایک اور

شعر ملاحظہ ہو :-

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں — کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

تصویر بھی کھنچتی ہے اور آدمی بھی کھنچتا ہے لیکن مفہوم دونوں کا جدا جدا ہے غالب نے محض اس لئے کہ کھنچنا دونوں محل پر مستعمل ہے ایک مہمل سی بات کہدی، ورنہ ظاہر ہے کہ نقش یا تصویر کا کھنچنا (احتراز کرنے کے معنے میں) کوئی مفہوم ہی نہیں رکھتا۔ امیر مینائی کے مذکورۂ بالا شعر کے ساتھ ہی ساتھ غالب کا یہ شعر بھی پڑھئے :-

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہئے

یہاں بھی وہی کھینچنے اور کھنچنے کی کشمکش ہے۔

ایک اور شعر غالب کا یاد آیا :-

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

سفیدی دیوار پر بھی ہوتی ہے اور آنکھ میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے دونوں کو ملا کر شعر مہمل کر دیا۔

ان چند اشعار کے علاوہ غالب کا اور کوئی شعر میری نگاہ سے ایسا نہیں گزرا جس پر ناسخیت کا اطلاق ہو سکے۔ آپ کو اگر یاد ہو تو بتائیے۔

غالب کے کلام میں کہیں کہیں معیوب قسم کا مبالغہ بھی ہے اور نقصِ تعبیر کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ناسخ کا رنگ اسکے یہاں یقیناً نہیں ہے، محض دو چار شعروں کو دیکھ کر یہ حکم لگانا قرینِ انصاف نہیں۔

(۴۴)

غالب و مومن ——— مکرمی ——— آپ نے بالکل صحیح لکھا کہ مومن کا سمجھنا آسان نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کا پڑھنا بھی آسان نہیں۔ اس کے اشعار کا لب و لہجہ خاص ہوتا ہے اور جب تک اسی انداز میں ان کو نہ پڑھا جائے مفہوم پیدا نہیں ہوتا ان کا مشہور شعر ہے :-

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی
مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

پہلے مصرعہ کو معمولی لب و لہجہ میں پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ مومن لوگوں کو منع کر رہا ہے کہ اس کی پری وش کو کوئی نہ دیکھے، لیکن حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پڑھیں تو مفہوم واضح ہو جائے گا یعنی میں نے تو اس کی طرف اس لئے نہ دیکھا تھا کہ رازِ محبت ظاہر نہ ہو لیکن میری یہ احتیاط ہی رسوائی کا باعث ہو گئی ورنہ ایسی پری وش کو نہ دیکھنا کیا معنی!

غالب کے یہاں نازک خیالی کی کمی نہیں، لیکن وہ تغزل سے کبھی کبھی ہٹ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ فلسفہ طرازی سے کام لیتا ہو تو بالکل چوب خشک ہو جاتا ہے لیکن مومن کا لوچ وہی رہتا ہے: زندگی اور غم دونوں کا لازم و ملزوم ہونا غالب نے اس طرح بیان کیا ہے :-

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بالکل حدیقۂ حکیم سنائی یا پند نامۂ عطار کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مومن اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

مفہوم اور طرزِ ادا دونوں میں غالب سے بڑھ گیا۔

مکر شاعرانہ میں تو خیر مومن کا کوئی ہمسر پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ رنگ اسی کی ایجاد تھا اور اسی پر ختم ہوگیا۔
غالب کے یہاں بھی اس کی بعض مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن مومن کے تیور کچھ اور ہیں۔ غالب کا مشہور شعر ہے :-

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

یہ مکر شاعرانہ ہے، لیکن مومن نے اس سلسلہ میں عجیب شاعرانہ نزاکتیں پیدا کی ہیں، کہتا ہے :-

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

مومن چاہتے ہیں کہ معشوق دشمن کی طرف نہ دیکھا کرے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ کیوں ماننے لگا اس لئے مومن نے یہ بہانہ پیدا کیا۔ اسی رنگ کے دو شعر اور سنئے :-

خواہشِ مرگ ہوا اتنا نہ ستا ورنہ　　دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا
درباں کو آنے دیجئے پہ میرے نہ کیجئے قتل　　ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

مومن کی حقیقی شاعری کا جوہر طنزیات میں کھلتا ہے یا پھر چلی کٹی میں۔ طنزیات کے بعض شعر ملاحظہ ہوں :-

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
رشکِ دشمن بہانہ تھا، سچ ہے　　میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

دوسرے رنگ کے لئے اس کی چھوٹی زمینیں دیکھئے :-

اب اور سے لو لگائیں گے ہم　　جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
سر دوشِ عدو پہ رکھ کے بیٹھے　　جانا نہ کہ سر اٹھائیں گے ہم
گر تیری طرف سے بےقراری　　کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم
بتخانۂ چیں ہو گو ترا گھر　　مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

(۴۵)

جلال لکھنوی ——— مکرمی۔ عنایت نامہ کا جواب غیر معمولی تاخیر سے جا رہا ہے، معذرت خواہ ہوں لکھنؤ کے دورِ متاخرین میں جلال کا سا اندازِ بیان، امیر کا کیا ذکر ہے، متوسطین میں آتش کو بھی نصیب نہ ہوا۔ اور اس حیثیت سے کہ خارجی و داخلی دونوں رنگ اس کے یہاں پوری طرح رچے ہوئے ہیں۔ مجھے تو دہلی میں بھی خال خال نظر آتا ہو وہ نہ صرف فن کا بادشاہ تھا بلکہ جذبات نگاری کا بھی مالک تھا، یقیناً اس میں نہ مومن کا رنگ ہے نہ غالب کے سے تیور، نہ آتش کا سا جوش و خروش ہے، نہ مصحفی کی سی حلاوت نہ حسرت و جرأت کا سا کھل کھیلنا ہے، نہ میر و درد کی سی فنادگی لیکن پھر بھی ایک چیز ایسی ہے جو تھوڑی دیر کے لئے ان سب کو

بھلا دیتی ہے، اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کا خارجی رنگ اس میں پوری طرح پایا جاتا ہے لیکن اس کا اسلوب بیان ایک ایسی دلکش بیک گراؤنڈ پیدا کر دیتا ہے کہ گہرائیوں کی جستجو کرنے والے بھی ایک بار سطح پر آکر ٹھٹک جاتے ہیں۔ رہی زبان کی صحت و پاکیزگی سو اس باب میں اس کی احتیاط سے کون واقف نہیں۔

اس کے یہاں یقیناً محبت کی کوئی ٹیس نہیں، کوئی تڑپا دینے والا درد نہیں، کوئی ایسا نشتر نہیں جو دل میں پیوست ہو جائے، اس کے یہاں تمام باتیں وہی ہیں جو آنکھ لڑانے اور آنکھ لگ جانے کے سلسلہ میں پیدا ہوتی ہیں، وہی گھاتیں اور لگاوٹیں ہیں جو محبت کی ادنیٰ قسم میں پائی جاتی ہیں یعنی اس کا کلام جو فضا پیش کرتا ہے وہ وہی زہر عشق والی فضا ہے کہ:-

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر وہیں رہتا تھا ایک سوداگر

اس کی ایک ماہ جبین لڑکی تھی، جس سے آنکھ لڑ گئی، آپس میں خط و کتابت ہوئی، ملنے کے بہانے ڈھونڈھے گئے، کبھی کامیابی ہوئی کبھی ناکامی، کامیابی ہوئی تو سرشاری وصل کی لذتوں کا ذکر ہونے لگا، ناکامی ہوئی تو گلہ شکوہ شروع ہو گیا، چند دن یہی ہنگامہ رہا اور آخر کار جب محبت کے حوصلے نکل گئے یا محبوبہ کہیں چلی گئی یا مر گئی تو صبر کر کے بیٹھ گئے۔

ظاہر ہے کہ محبت کی اس دنیا میں جو جذبات پیدا ہوں گے ان میں کوئی گہرائی نہ ہوگی اور نہ وہ شاعری میں کوئی مستقل نقش چھوڑ جائیں گے لیکن جلالؔ کا کمال یہی ہے کہ اس نے اسی فضا کی شاعری میں محض اپنے انداز بیان سے وہ باتیں پیدا کی ہیں کہ ہم اس کی داد دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جلالؔ کا ایک شعر ہے:-

دل سے تنگ آئے ہیں ہم جوش جنوں کا کیسا
یوں گریباں نہیں کیا پھاڑتے سودا کیسا

کہنے والے تو خیر کسی اور موقع کے لئے کہا ہوگا لیکن میں اس کو جلالؔ کی شاعری پر منطبق کر کے دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر تبصرہ اور کوئی نہیں ہو سکتا یعنی اس کی شاعری جوش جنوں کی شاعری نہ تھی بلکہ دل سے تنگ آجانے کی تھی، اور اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ اس کی "گریباں چاکی" کم دلچسپ نہیں ہے۔

اسی زمین کا ایک اور شعر سنئے:-

اپنا ہاتھ، اپنی چھری، اپنا گلا ہے ایک دن
خنجر و بازوئے قاتل کا بھروسہ کیسا

بالکل لکھنؤ کے خارجی رنگ کا شعر ہے لیکن الفاظ کی نشست اور اسلوب بیان نے ایک بات پیدا کر دی ہے جس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

جلالؔ کے ہمعصر داغؔ و امیرؔ کو تو چھوڑئے کہ ان کے یہاں بے معنی تصنع کے سوا کچھ نہیں، لیکن داغؔ و جلالؔ کے انفرادی رنگ کا علٰحدہ علٰحدہ متعین کرنا مشکل ہے، دونوں کے یہاں زبان ہے، سلاست ہے، تیکھا پن ہے، وہی کوٹھوں کی باتیں ہیں اور وہی چبھتے چوچلے، تاہم اگر دونوں کا غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ داغؔ کبھی کبھی بالکل آپ سے باہر ہو کر ایسی نیچی سطح پر آجاتے ہیں جہاں "مٹی کی بھی لے تو دوا ہے شباب میں" لیکن جلالؔ کے یہاں ایک شعر بھی ایسے رکیک ذوق کا نہ ملے گا۔ "گلزار داغ" کا داغؔ تو بے شک جلالؔ سے ملتا جلتا ہے لیکن "آفتاب داغ" کا داغؔ جلالؔ سے علٰحدہ ہے۔

وہ رنگ جس میں دونوں مشترک نظر آتے ہیں یہ ہے :-

مری داستانِ فراق نے شبِ وصل حرفِ مزا دیا
کہیں میں نے رو کے ہنسا دیا کہیں اپنے ہنس کے رُلا دیا

کب آئے گا کوئی مجھ تک جواب دیتا جا ‖ تسلیاں بھی تو اے اضطراب دیتا جا

نہ خوف آہ بتوں کا نہ ڈر ہے نالوں کا ‖ بڑا کلیجہ ہے ان دل دُکھانے والوں کا

سیکڑوں ہار انھیں پہنا دئے ہوں گے ہم نے ‖ کیا اگر قبر پہ دو پھول چڑھا جاتے ہیں

خوش نصیب اس سے زیادہ کوئی دنیا میں نہیں ‖ پیار سے جس کو وہ کمبخت کہا کرتے ہیں

کہدیں تم سے کون ہیں کیا ہیں کہاں ہیں تم ‖ بیخود ہوں گو اپنے تم ہوش میں آنے بھی دو

چونکا رہا ہوں وصل کی شب چونکتے نہیں ‖ کچھ نیند ہے شباب کی کچھ خوابِ ناز ہے

دعوے کرتے تو ہو وفا کا جلال ‖ دیکھو وہ شوخ بے وفا نہ سنے

تمھاری بزم میں ہم خود سنبھل جاتے یہ مشکل تھا ‖ تمھیں بیتاب کرتے تھے تمھیں پھر تھام لیتے تھے

ہم پھر ان کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے ‖ پھر ہمیں پیار آگیا جب وہ خفا ہونے لگے

ہائے قاتل نے ہمیں کو نہ کیا قتل جلال ‖ مجرم آخر وہی ٹھہرا جو گنہگار نہ تھا

لیکن کبھی کبھی جلال اس رنگ سے ہٹ کر بھی کہہ جاتا ہے، ملاحظہ ہو :-

رگِ گلو ہے جگہ یار جاودانی کی ‖ صدا قریب سے آتی ہے لن ترانی کی

میں شوقِ دید میں کیا جانے کتنی دور آیا ‖ کھلی بھی آنکھ وہیں جب قریبِ طور آیا

اور یہیں سے وہ شاید داغ سے ممتاز ہو جاتا ہے۔

یہ رنگ حقیقتاً مصحفی کا پیدا کیا ہوا تھا جس کو آتش نے خوب نبھایا اور ناسخ نے بھی گاہے گاہے اس طرف توجہ کی مثلاً

اُڑا کے ساتھ یہ مشتِ غبار لیتا جا ‖ مجھے رکاب میں او شہسوار لیتا جا

فرصت ہوئی تو کسی وقت داغ وجلال کا موازنہ کروں گا، امیر و داغ کا موازنہ کرنے خواہ مخواہ لوگوں نے وقت ضایع کیا۔

(۴۶)

ایک شعر —— مکرمی - تسلیم - عنایت نامہ کا شکریہ - میری رائے میں شعر کا مطلب یہ نہیں ہے :-

ضبطِ فغاں گو کہ اثر تھا کیا
حوصلہ کیا کیا نہ کیا، کیا کیا

"ضبطِ فغاں نے اثر کیا تھا" یہ مطلب آپ نے کہاں سے نکالا اور دوسرے مصرعہ سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اسکو یوں پڑھیے

ضبطِ فغاں - گو کہ اثر تھا - کیا

یعنی ہر چند فغاں میں اثر تھا لیکن ہم نے ضبط سے کام لیا۔ اب دوسرا مصرعہ اس سے مربوط ہو گیا یعنی ہم نے کیا کیا کہ یہ حوصلہ کیا، مطلب یہ کہ باوجود فغاں میں اثر ہونے کے ہم نے ضبط سے کام لیا اور اب اس پر افسوس کرتا ہوں کہ ایسا کیوں کیا۔

اس میں شک نہیں کہ مومن کا یہ انداز بسا اوقات بڑی الجھن میں ڈال دیتا ہے، لیکن اگر محذوفات و روابط کو سمجھ کر غور کیا جائے تو اشکال دور ہو جاتا ہے۔ اسی زمین کا ایک شعر ہے:-

جائے تھی تیری مرے دل میں سو ہے
غیر سے کیوں شکوۂ بے جا کیا

مدعا یہ صرف ظاہر کرنا ہے کہ "غیر کے دل میں تیری جگہ کبھی تھی ہی نہیں، لیکن پورے شعر میں اس کا کہیں ذکر نہیں، لیکن اس کو ظاہر کیا اس انداز سے کہ "جائے (جگہ) تھی تیری مرے دل میں سو ہے"۔

مومن کے یہاں اس میں شک نہیں بعض جگہ نہایت نامناسب تعقیدیں پائی جاتی ہیں مثلاً:-

یہی حالت رہی آٹھوں پہر تجھ بن کہ دم الٹے
سحر تک شام سے دل صبح سے تا شام لیتا تھا

اس کی نثر یوں ہوگی "تجھ بن آٹھوں پہر یہی حالت رہی کہ دل شام سے سحر تک اور صبح سے تا شام الٹے دم لیتا تھا، لفظ الٹے پہلے مصرعہ میں آیا ہے اور لیتا تھا دوسرے مصرعہ کے آخر میں کتنی سخت تعقید ہے۔

(۴۷)

غالب ——— مکرمی - آپ نے غالب کی شاعری پر جو کچھ تبصرہ فرمایا ہے، اس سے مجھے بڑی حد تک اتفاق ہے لیکن یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ اس نے استعمال الفاظ میں کوئی غلطی نہیں کی یقیناً وہ لغت پر عبور رکھتا تھا وہ جانتا تھا کہ ایک لفظ کے صحیح مفہوم کیا ہے لیکن محل استعمال میں کہیں کہیں اس نے غلطیاں کی ہیں گو وہ ایسی نہیں کہ ہر شخص کی نگاہ ان پر پڑ سکے۔ میں نے اس سے قبل مثالاً یہ شعر آپ کو لکھا تھا:-

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

اس پر غور کرنے کی دعوت دی تھی لیکن آپ کے نزدیک اس میں کوئی بات محلِ نظر نہیں - میں سمجھتا ہوں، ہے -

شعر کا مطلب واضح ہے، لیکن لفظ "لذت" کا استعمال میری رائے میں صحیح نہیں کیا گیا- غیر نے تو یہ طعن دیا تھا کہ غالب زخم سلوا رہا ہے یعنی چارہ جوئی سے اپنی تکلیف کم کرنا چاہتا ہے- اس کا جواب غالب کو یہ دینا چاہئے تھا کہ "غیر کا یہ طعن درست نہیں کیونکہ زخم سوزن میں تکلیف نہیں ہوتی" لیکن اُس نے یہ کہا کہ "زخمِ سوزن میں بھی لذت ہے"۔ غیر کا طعن تو یہی تھا کہ غالب لذت و راحت کا خواہشمند ہے اور اسی کی تصدیق غالب نے بھی کر دی -

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ "کیوں صاحب، مصیبت میں آپ مجھ سے جدا ہو گئے" اور آپ یہ جواب دیں کہ "کیا آپ سے جدا ہونا راحت نہیں ہے" تو وہ کیا سمجھے گا، اگر دوسرے مصرعہ کا انداز یہ ہوتا کہ "غیر زخمِ سوزن کو بھی شاید لذت سمجھتا ہے" تو بے شک درست ہوتا- اس میں شک نہیں کہ غالب نے لذت کہکر اذیت ہی کا مفہوم لیا ہے لیکن اپنے نقطۂ نظر سے نہ کہ غیر کے زاویۂ نگاہ سے لیکن چونکہ جواب دینا ہے غیر کو اس لئے اسی کے نظریہ کو سامنے رکھنا چاہئے تھا۔

(۴۸)

نگاہ شاعروں کی نگاہ میں ——— اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ میں اس بزم سے کیا لے کر آیا۔ آہ

وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم تھی

نگاہ کی قسمیں اتنی ہیں کہ شمار مشکل ہے، سرشار، سرکش، تلخ، نوشیں، غلط انداز، عالم آشوب، عافیت سوز، تغافل پسند، گرم خو، عربدہ پرور وغیرہ وغیرہ اور فارسی شعراء نے عجیب عجیب انداز سے اس کا ذکر کیا ہے۔ ظہوری کہتا ہے:۔

دیوانۂ زنجیرِ نگاہِ تو نگشتست

دیوانہ کہ دارند بزنجیرِ نگاہش

ملا جامی بجود ایک جگہ لکھتا ہے:۔

نگاہ محشرِ الفت، کرشمہ ناز فروش

نگاہ کو "محشرِ الفت" کہنا کس قدر پیاری بات ہے۔

اسی کی دوسری تعبیر سنئے:۔

مہیا کرد اسباب جنوں را شوخیِ جنبش

تبسم سازِ بے ہوشی، نگہ مضرابِ بیتابی

ظہوری کا ایک شعر قیامت کا سنئے:۔

مے نخور دست غالبؔا ہرگز

آنکہ گفت ست مے نگاہش را

لیکن غالبؔ کی یہ نگاہ، جو بظاہر نگاہ سے کم ہے، سب سے جدا ہے۔

اس میں بظاہر کی تخصیص نے جو خصوصیت پیدا کر دی ہے اس کو دیکھ کر بار بار عرفی کا شعر یاد آتا ہے:۔

ہجومِ شوقِ تماشا و تیغِ شرم ببیں

کہ دامنش زنگاہِ چکیدہ لبریزست

"نگاہِ چکیدہ" صرف عرفی کہہ سکتا تھا یا بیدلؔ ——— میں جانتا ہوں

آپ نے یہ سوال کیوں کیا ہے؟ اچھا تو اب اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔

(۴۹)

ذکرِ غالب ——— حبیبی، خط پہونچا، آپ کی برہمی بالکل بجا ہے۔ میں نے قتیلؔ و غالبؔ کو دیکھا ہے بلکہ اس پر ریویو بھی کر چکا ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ فارسی شاعری میں غالبؔ کے سامنے قتیلؔ کیا، بڑے بڑے مستند شاعروں کا ذکر کچھ یونہی سی بات ہے۔ غالب اپنے اخلاق کے لحاظ سے جیسا کچھ بھی رہا ہو، لیکن شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی جگہ تنہا نظر آتا ہے، ہموطن ہونے کے لحاظ سے انورؔی صاحب پر قتیلؔ کا جتنا حق پایا جاتا تھا، اس سے زیادہ انھوں نے ادا کر دیا، لیکن جب تک وہ یہ نہ ثابت کر دیں کہ قتیلؔ شاعری میں بھی غالبؔ کا ہمسر تھا، نہ قتیلؔ کی روح خوش ہو سکتی ہے، نہ خود ان کا ضمیر، اور یہ محال ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قتیلؔ پر نکتہ چینی کرنے میں غالبؔ نے صرف زبانی روایات پر اعتماد کیا اور خود قتیلؔ کا کلام مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی لیکن اس سے قتیلؔ کی شاعری کو کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے۔

غالبؔ کی شاعری کا یہ تیکھا پن کہ :-

"دماغِ نازکِ من برنمی تابد تقاضا را"

اس کی شاعری میں ہر جگہ پایا جاتا ہے اور اس کی یہ خصوصیت مشکل ہی سے کہیں اور مل سکتی ہے۔

شعراء کے کلام میں شوخی بھی پائی جاتی ہے اور رنگینی بھی، ندرتِ بیان بھی نظر آتی ہے اور لطفِ زبان بھی لیکن ان سب کے مل جانے کے بعد جو ایک نئی چیز بنتی ہے وہ غالبؔ ہی کے یہاں ملے گی۔ عرفیؔ، نظیریؔ، بیدلؔ، حافظؔ، خسروؔ اس کے یہاں کیا نہیں۔ نہیں ہے ایک تو سعدیؔ! لکھتا ہے :-

تا چہا آئینہ حسرتِ دیدار تو ایم ———— جلوہ برخود کن و ما را بہ نگاہے دریاب

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن ———— ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

کہئے بیدلؔ سامنے آ گیا نہیں۔ ایک اور سنئے خسروؔ کے رنگ کا :-

امید لطف تو دل می دہد بدیں شادم

دگر نہ تاب صبوری ازیں زیادم نیست

حافظؔ کا رنگ ملاحظہ ہو :-

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم ———— قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے بہ رہگزر پاشیم ———— مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

اب عرفیؔ کا رنگ دیکھئے :-

چہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحثِ ناز پیچیدن

نگہ در نکتہ زائیہا، نفس در سرمہ سائیہا

انداز نظیریؔ کی مثالیں ملاحظہ ہوں :-

مرا د میدنِ گل در گماں فگند امروز ———— کہ باز بر سرِ شاخِ گل آشیانم سوخت

ما و خاکِ رہ گزر بر فرقِ عرفاں ریختن ———— گل کسے جوید کہ او را گوشۂ دستار ہست

اب چند شعر ایسے سنئے جہاں وہ اپنے رنگ میں بالکل منفرد نظر آتا ہے :-

آں راز کہ در سینہ نہاں ست نہ وعظ است ———— بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

کارے عجب افتاد، بدیں شیفتہ ما را ———— مومنؔ نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت

در خموشی تابشِ روئے عرق ناکش نگر ———— تا چہا ہنگامۂ سرگرمی گفتار ہست

آنکہ بے پردہ بصد داغ نمایانم سوخت ———— دیدہ پوشید و گماں کرد کہ پنہانم سوخت

نہ بدرجستہ شرارونہ بجا ماندہ رماد ———— سوختم لیک ندانم بہ چہ عنوانم سوخت

بیا و جوشش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامید نیم
نہ دیدن تو شنیدم، شنیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیانگہ شد
بانتظار ہما دام چیدنم بنگر

می ربایم بوسہ و عرض ندامت می کنم
اختراعے چند در آداب صحبت می کنم

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم

راہے ز کنج دیر بہ مینو کشودہ ام
از خم گسستم پیالہ و در کوثر افگنم

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

دہید بادۂ گلفام، چوں سلام کنم
ہماں بہ بادہ سلام مرا دہید جواب

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا
ہلاکم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جز روزۂ درست ز صہبا کشودۂ

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

کہاں تک لکھوں، ایسے نوادر اس کے یہاں ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں اور اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ غریب قتیل کا کیا حوصلہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے منہ آئے :-

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم و لے
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

(۵۰)

تغزل —— گرامی عزیز —— غزل دیکھی، یوں آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہیئے تو تعریف کر دوں لیکن میری رائے میں آپ کی غزل کا ایک شعر بھی صحیح رنگِ تغزل نہیں رکھتا، آپ اس باب میں میری رہنمائی و ہدایت چاہتے ہیں، لیکن میں کیونکر سمجھاؤں کہ تغزل کس چیز کا نام ہے اور اس کا صحیح معیار کیا ہے۔

ذوق کا شعر ہے :-

ساتھ آہ کے شب، دل سے وہ پیکاں نکل آیا
تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا

فن کے لحاظ سے اس میں کوئی خامی نہیں، لیکن شعریت یا تغزل سے اسے کیا واسطہ؟ اسی دل سے "پیکاں نکلنے" کو میر اس طرح کہتا ہے:

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینہ سے لیکن جاں سمیت

آپ ان دونوں میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر میرؔ کا شعر آپ کے دل پر کوئی اثر چھوڑ جاتا ہے تو غور کیجئے کہ کیوں؟ اسی چیز کا نام تغزل ہے۔ لیکن اگر آپ کو ذوقؔ کا شعر زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے تو پھر آپ کو کسی رہبری و ہدایت کی ضرورت نہیں آپ آزاد ہیں جو چاہے کہئے اور جو چاہے کیجئے۔

ذوقؔ کی ایک مشہور غزل ہے "قابل ہوتا، مقابل ہوتا" قابل کا قافیہ انھوں نے اس طرح نظم کیا ہے:-

سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

دوسرا مصرعہ بہت پاکیزہ ہے لیکن پہلے مصرعہ میں سینۂ چرخ اور اختر نے شعر کو تغزل سے علٰحدہ کر دیا۔ اسی قافیہ میں شہیدی کا شعر سنئے:-

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا صحیح ذوق بالکل خدا کی دین ہے اور کوشش سے حاصل نہیں ہوتا —— پھر یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص شعر بھی ضرور کہے، شاعر ہونا کوئی بڑی عمدہ بات نہیں جس پر آپ کو رشک آئے۔ لیکن اگر آپ اس مشغلہ کو ترک کرنا نہیں چاہتے تو غزل کا خیال چھوڑ دیجئے، اور بہت سے اصناف سخن ہیں ان پر تیغ آزمائی کیجئے۔

(۵)

ذکر بیدل —— صدیق محترم! - خط ملا، نہ پوچھئے کتنی مسرت ہوئی، اب تو کوئی شخص بیدل کا ذکر کر دیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "صدائے الست" معلوم نہیں کتنی دور سے آرہی ہے۔ حال ہی میں ایک صاحب تشریف لائے تھے، وہ بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے بیدل کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں، مجھ سے مدد و مشورہ کے طالب تھے، وہ کہتے رہے میں سنتا رہا اور جب اخیر میں، میں نے اُن سے فرمائش کی کہ بیدل کا کوئی شعر سنائیے جو آپ کو بہت پسند ہو، تو معلوم ہوا کہ حضرت نے صرف بیدل کا نام ہی سُنا ہے اور اس کا کلام دیکھنے کی نوبت کبھی نہیں آئی، میں نے پوچھا کہ آپ اپنا مقالہ کب تک پیش کرنا چاہتے ہیں، فرمایا "سال آیندہ"۔ میں نے جواب میں بیدل کا یہ مصرعہ انھیں سنا دیا:-

ز شبنم بخیہ نتواں کرد چاک دامن گل را

اور خاموش ہو رہا!

آپ سے مگر میں ایسی باتیں نہیں کر سکتا، کیونکہ آپ کے مطالعہ و ذوق دونوں سے واقف ہوں!

سب سے پہلا اور سب سے بڑا کام یہ ہے کہ بیدل کے کلام کی جستجو کی جائے، عرصہ ہوا نول کشور پریس نے اس کا کلیات اور مجموعۂ نثر جس میں چہار عناصر اور نکات بھی شامل تھے طبع کیا تھا، اور ہر چند وہ مکمل نہ تھا، لیکن اب یہ نامکمل اڈیشن بھی نہیں ملتا۔ نولکشور سے پہلے مطبع صفدری بمبئی نے ۱۲۹۹ھ میں ایک مجموعہ شایع کیا تھا اور وہ نسبتاً زیادہ مکمل تھا۔ مگر اب وہ بھی نایاب ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان کے کتب خانوں میں کہاں کہاں اس کی تصانیف کے مخطوطات مل سکتے ہیں۔ مگر ہوں گے ضرور! جس زمانہ میں میرا قیام حکیم اجمل خاں مرحوم کے پاس تھا، اس وقت ان کے کتب خانہ

میں ایک قلمی نسخہ بیدل کا دیکھا تھا، جس میں بہت سی چیزیں مطبوعہ نسخوں سے زیادہ تھیں۔ معلوم نہیں یہ نسخہ اب بھی ہے یا نہیں!

نثر میں اس کی تین چیزیں ہیں، نکات، چہار عنصر، اور رقعات، لیکن ان میں بھی ہزاروں اشعار پائے جاتے ہیں! باقی اس کا تمام کلام منظوم ہے، جس کے شعروں کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے!

اس کے دیوان میں بھی تیس ہزار اشعار سے کم نہیں لیکن اس کی دوسری تصانیف میں بھی غزلیں اتنی کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ اگر ان سب کو اکٹھا کر لیا جائے تو اس کے دیوان کا حجم دو چند ہو سکتا ہے۔

میرے پاس وہی بمبئی والا نسخہ ہے، اس میں سب سے پہلے مثنوی عرفان درج ہے اور پھر مثنوی طور معرفت، اس کے بعد نکات، اشارات، رقعات، چہار عنصر، مثنوی محیط اعظم، غزلیات، رباعیات، مثنوی طلسم حیرت، قصاید فیوض ہیں اور گو میں جانتا ہوں کہ یہ نسخہ ناقص ہے، تاہم اس میں بھی جو کچھ ہے، وہ اتنا ہے کہ ایک شخص پوری عمر صرف کرنے کے بعد بھی اس کا مطالعہ ختم نہیں کر سکتا۔ پندرہ سال کی عمر سے اس وقت تک بیدل کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ لیکن اس سمندر سے ایک قطرہ بھی نہیں اٹھا سکا۔ بیدل کا ذوق انسان میں عجیب قسم کا ذہنی استسقا پیدا کر دیتا ہے اور وہ اس کی ہر چیز سمجھ لینے کے لئے اس کے کلام کی بے تابانہ ورق گردانی کرنے لگتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کی کسی خصوصیت کو نہیں پہچان سکتے!

میری رائے میں سب سے پہلے چہار عنصر کا مطالعہ کرنا چاہئے کیونکہ اسی سے کچھ پتہ بیدل کی زندگی کا بھی چلتا ہے، نیز یہ کہ کن واقعات و حالات سے وہ کیونکر متاثر ہوا، اس کے بعد نکات پڑھنا چاہئے۔ اور اگر زندگی وفا کرے تو پھر اسکی مثنویوں کی تلاوت کرنا چاہئے کہ بیدل کی شاعری کا کمال انھیں سے ظاہر ہوتا ہے!

بیدل کا کلام اپنے پیام کے لحاظ سے یکسر غیر متنوع ہے، اور زبان کے لحاظ سے بھی درس و تدریس کی چیز نہیں، لیکن انداز بیان اور نزاکت تخییل کے لحاظ سے وہ یقیناً اس دنیا کی چیز نہیں۔ بیدل ہی دنیا کا سب سے پہلا، اور آخری شاعر ہے، جس کی زبان اس کی تخییل نے پیدا کی اور تخییل ماورائی ادراک نے۔

اگر کبھی لکھنؤ آنا ہو تو تکلیف فرمائیے، یہ باتیں خط و کتابت سے طے کرنے کی نہیں!

(۵۲)

شعر بیدل —— نیاز نوازی کا شکریہ —— مکتوب گرامی کا جواب کافی تفصیل چاہتا ہے اور شاید حضوری بھی۔ سوال میں ایک چیز مجھ سے متعلق ہے اور دوسری آپ سے!

آپ کا بیدل سے لگاؤ بڑی مسرت آمیز حیرت کی بات ہے۔ مسرت تو اس لئے کہ آپ میری ہم مشرب نکلیں، اور حیرت اس لئے کہ آج کل مردوں میں بھی کوئی شناسائے بیدل نظر نہیں آتا چہ جائیکہ نسائی طبقہ کے کسی فرد کی طرف سے اس ذوق کا اظہار!

(۱) دل کو آئینہ تمثال کہنا بیدل کی بڑی محبوب تعبیر ہے، اور چونکہ آئینہ کا کوئی نقش مستقل نہیں ہوتا، اس لئے وہ اسے "وحشت پیوند" کہتا ہے۔ شعر[لہ] کا مفہوم یہ ہے کہ میرے دل میں جو نقش ابھرتا ہے، وہ آخرکار وحشت انجام ہی نظر آتا ہے۔

لہ بیدل کا شعر یہ ہے:-

بدل نقشے نمی بندد کہ با وحشت نہ پیوندد!

نمی دانم کدا میں بے وفا آئینہ چید اینجا!

اس لئے حیران ہوں کہ وہ کون بے وفا ہے جس نے میرے دل کو آئینۂ تمثال بناکر اس عذاب میں مبتلا کر دیا، مدعا یہ کہ دل میں اب سوا جلوۂ دوست کے کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے، اور اس کے علاوہ جو خیال پیدا ہوتا ہے، وہ باعث وحشت ثابت ہوتا ہے۔ بیوفا یہاں پیار کے لب ولہجہ میں استعمال کیا گیا ہے!

(۲) یقیناً تسبیح و زنار کی نزاع بڑی فرسودہ و بے کیف چیز ہے لیکن آپ اس کا خیال ہی کیوں دل میں لائیں، دُنیا میں اصل چیز "متاعِ محبت" ہے اور اگر وہ دیر و حرم میں میسر نہیں آتی تو پھر اُسی کو مرکزِ خیال بنائیے جہاں یہ دستیاب ہو، اور یہی وہ منزل ہے جہاں مجاز بھی حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے!

(۳) عقل و ہوش کے صحیح معیار کا پتہ ہم کو زیادہ تر "اجتماعیات" میں چلتا ہے، ورنہ انفرادی حیثیت سے تو عقل و ہوش صرف خود غرضی کا دوسرا نام ہے، اللہ اور بُت کا فرق خدا اور خداوند کا سا فرق ہے، اس لئے پوجنے کے لئے تو بُت ہی موزوں ہے۔ ہاں، اگر خود اپنی پرستش کا خیال دل میں پیدا ہوا تو پھر اپنی جستجو کیجئے اور یہی ہے غالباً خدا کی جستجو!

(۴) غالب کے اُردو فارسی کلام سے صرف دو شعروں کا انتخاب بہت مشکل ہے۔ پسندیدگی دراصل ایک کیفیت ہے جو موقعہ ومحل کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔

(۵) حقیقی شاعری نام ہے حقیقتوں کے احساس و اظہار کا ایسی زبان اور ایسے لب ولہجہ میں کہ ان حقیقتوں کے سمجھنے کے لئے ہم کو زبان یا لب ولہجہ کے سمجھنے کی ضرورت پیدا نہ ہو!

مذہب واخلاق

(۱)

طاعت وعبادت ——— حضرت، یہ آپ کس زمانہ کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ "قالوبلیٰ" کہنے والوں میں میری روح بھی شامل تھی۔ "لن ترانی" کی توہین برداشت کرنے والے کب کے ختم ہو چکے اور اس وقار خودداری کے دور کو بھی ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا۔ مگر آپ ہنوز "وادی ایمن" کا خواب دیکھ رہے ہیں یعنی،

اگر شراب نہیں، انتظار ساغر کھینچ ——— معقول!

قبلہ، طاعت وعبادت کا مفہوم اگر صرف یہ ہے کہ پیشانی رگڑ رگڑ کر تقدیر کے لکھے کو مٹایا جائے (حالانکہ آپ اس کے بھی قایل نہیں) تو یہ "گھس گھس" میرے بس کی بات نہیں، لیکن اگر اس سے مقصود کوئی "استعداد روحانی" بھی ہے تو مجھے بتائیے کہ اس کا انحصار "تسبیح ومصلا، ریش وبروت" پر کیوں ہو؟

درکار عشق نالہ وآہے ضرور نیست

میں سمجھا کہ یہ بدگمانی آپ کو کیوں پیدا ہوئی۔ برسوں کے بعد آپ نے مجھے دیکھا اور ایسی صورت میں جس کی توقع آپ کو نہ تھی "توقع" کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا اندیشہ کہنا چاہیے۔

(۲)

مذہب ورندی ——— محبت پناہا ——— گرامی نامہ ملا، خوش ہوا کہ آپ اس باب میں میرے ہمنوا ہیں۔ بے شک تفصیل کی ضرورت ہے لیکن ابھی نہیں، وقت آنے دیجئے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ

ترانۂ کہ نہ گنجد بہ سازی خواہم

یہی وہ چیز ہے جو سیاسیات میں "اشتراکیت" کہلاتی ہے اور مذہبیات میں "ترک رسم" والی "وحدانیت" اگر اللہ کا وجود ہے تو لاکھ انکار کیجئے وہ موجود ہی رہے گا، انسان کچھ کرے لیکن خدا کی خدائی اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئے گی۔ پھر خالق ومخلوق کا یہ تعلق کو وہ انکار سے متاثر نہیں ہوتا اور یہ اقرار پر مجبور نہیں، مٹا دیجئے تو دنیا رہنے کے قابل نہ رہے۔ اللہ اللہ آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے لیکن اسی کے ساتھ "تصدیق بالجنان" ازبس ضروری ہے کہ رندی نام بدتمیزی کا نہیں بلکہ انتہائی تمیز کا ہے۔

مذہب کی دُنیا میں بداخلاقی کی گنجایش ہو تو ہو، لیکن یہاں سب سے پہلے یہی سوال ہوتا ہے:۔

توبرونِ درچہ کردی کہ درون خانہ آئی

کہتے ہیں کہ تصوف بھی رندی ہی کی ایک شاخ ہے لیکن میں اسے صرف شاعری کہتا ہوں اور شاعری بھی مولانا ناسخ رحمۃ اللہ علیہ

کی، کیونکہ صوفی کہتا ہے کرتا نہیں، اور خرابات میں عمل کے سوا سب حرف باطل ہے۔

غالب کا یہ شعر تو آپ کو یاد ہوگا، لیکن پھر سُناتا ہوں، کہتا ہے :-

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یہ وہ شرارتیں ہیں جن پر خدا کو بھی پیار آجاتا ہے، لیکن "اہل تقشف" اتنی تفریح بھی جائز نہیں سمجھتے ان کے نزدیک گویا کائنات نام ہے قدرت کی "شکن پیشانی" کا۔

(۳)

خدا اور میں ——— مطاعی الاعز- والانامہ پہونچا۔ آپ نے جس باب میں میرا مشورہ طلب فرمایا ہے وہ یقین جانئے میری فہم سے بالاتر ہے۔ میں اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے نہایت معمولی انسان ہوں اور میری عقل کی پرواز میری نگاہ سے زیادہ نہیں۔ جو چیز دیکھتا ہوں وہی سمجھتا ہوں اور آپ رائے طلب فرماتے ہیں ان باتوں میں جو میرے خیال کو بھی تھکا دینے والی ہیں، نگاہ کا کیا ذکر!

اس وقت تک دنیا میں مجھے صرف دو باتوں کا علم حاصل ہوا ہے، ایک کا تعلق خدا سے ہے اور دوسری کا اپنی ذات سے۔ وہ یہ خدا کا انکار اس کی انتہائی عظمت ہے اور یہ کہ:-

مشرب پروانہ از آتش نداند طور را

انا الحق، وحدانیت کا بڑا بلند مرتبہ سمجھا جاتا ہے، لیکن "انکار" اس سے زیادہ بلند ہے، خدا کا انکار حقیقتاً عجز فہم کا اقرار ہے اور یہی آخری حد ہے اس کے سمجھنے کی دوسری بات سے آپ خود واقف ہیں، صراحت کی ضرورت نہیں۔

ہاں، تو مدعا یہ کہنا ہے کہ آپ نے جس مسئلہ کو چھیڑا ہے وہ (آپ ہی کی اصطلاح میں نہ لاہوت سے تعلق رکھتا ہے، نہ ناسوت سے یعنی نہ خدا سے نہ مجھ سے اس لئے میں کیا عرض کر سکتا ہوں، اور اگر کچھ کہوں بھی تو اس کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

بہرحال اس باب میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں، لیکن اگر اس سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں مخالف ہوں تو میں اس کی بھی تردید نہ کروں گا بشرطیکہ اس کی ذمہ داری آپ اپنے سر لیں۔ میں یہ سننے کے لئے منتظر رہوں گا کہ آپ نے کیا فیصلہ فرمایا۔ انتقاد و تبصرہ کی غرض سے نہیں بلکہ محض اعتبار و بصیرت کے لئے۔

(۴)

خدا اور بُت کا فرق ——— استغفر اللہ، کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جس چیز کو تم اتنا اہم سمجھتے ہو اب کھیل سے زیادہ نہیں۔ بسم اللہ کے گنبد میں تم نے پرورش پائی ہے، تمہیں کیا خبر کہ "عقل و ہوش" کا معیار اب کیا ہے۔ سجدے کرتے کرتے، ناک رگڑتے رگڑتے ڈیڑھ ہزار برس کا طویل زمانہ گزر گیا لیکن اب تک تم نے خدا اور بُت کے فرق کو نہ سمجھا۔

برہمن گشتے گر ایں قدر زنار می بستم

ایک طرف یہ بھی کہتے ہو کہ اسلام نے بُت پرستی کو مٹایا اور دوسری طرف اسی میں مبتلا بھی ہو۔ بت خواہ وہ خدا ہی کا کیوں ہو بُت ہے اور توڑے جانے کے قابل اور خدا، خواہ وہ کوئی بُت ہی کیوں نہ ہو، قابل پرستش ہے۔ مگر تم اس نازک فرق کو نہیں سمجھ سکتے جاؤ اُٹھو وضو کرکے نماز پڑھو، تمہارا بُت تم سے خفا نہ ہو جائے۔ میں بھی جاتا ہوں، آئینہ سامنے رکھ کر اپنے خدا کو پوجوں گا۔

(۵)

مولویوں کا طبقہ ——— حضرت سلامت، آپ نے بھی کس طبقہ کا ذکر کیا۔ آپ اتنا وقت کسی اور گناہ میں صرف کرتے تو بہتر تھا۔ یہ "محراب و منبر" سے "حلقۂ دام" طیار کرنے والے، یہ باوجود "کوتہ آستینی" کے انتہائی "دراز دستی" سے کبھی نہ چوکنے والے اور یہ سب کچھ کر گزرنے والے جو دوسروں کے لئے ممنوع ہے، ہماری قوم کے وہ افراد ہیں جنھیں پاؤں کا چھالا کہنا چاہئے کہ جب تک آپ انھیں پھوڑ نہ ڈالیں، راستہ چلنا ممکن نہیں، انھوں نے سلطنتوں کو کھا لیا، قوموں کو ہضم کر لیا، مذہب کیا چیز ہے، یہ ملک و ملت کے لئے بیماری ہے اور بیماری بھی دق کی، استسقا کی جس سے چھٹکارا ممکن نہیں اس لئے اگر اتنے طویل و تلخ تجربہ کے بعد اس سے کوئی توقع فلاح کی رکھئے تو اس کے "اہلِ جنت" ہونے میں کوئی شک نہیں، قدرت نے اول اول جب تخلیق کائنات کا ارادہ کیا تو سوا "حسن محض" یا "خیر محض" کی آفرینش کے کوئی خیال سامنے نہ تھا۔ چنانچہ ایک زمانہ تک اُس نے اپنا سارا وقت "تخلیق جمال" میں صرف کیا، سوء اتفاق سے دفعتاً یہ فلسفیانہ بات ذہن میں آئی کہ "حسن" تو بالکل امتیازی چیز ہے اور اس کا کوئی مفہوم اس وقت تک متعین ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کی ضد موجود نہ ہو، یہ خیال آتے ہی دفعتاً ردعمل ہوا اور اتنا شروع کیا ایک وقت ایک ہی چیز سے تمام "مناظر جمال" کے اُبھارنے کا کام لے لیا گیا، آپ کو معلوم ہے یہ "ایک چیز" کیا ہے؟ یہی! اس لحاظ سے تو اس کا وجود ضروری ہے کہ یہ نہ ہو تو "تعینات جمال" کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا، مشکل یہی ہے کہ دنیا اس حقیقت سے آگاہ نہیں اور کانٹوں ہی کو حاصل چمن سمجھنے لگی ہے، پھر اگر اس خارزار کے دفع کرنے کے لئے ایک بار باغ اُجاڑ دینا ہی ضروری قرار پائے تو ہمیں اس میں بھی تکلف نہ کرنا چاہئے۔ جب عضو ماؤف کاٹا جاتا ہے تو اسی کے ساتھ جسم صحیح کا بھی ایک حصہ شامل کر لیا جاتا ہے اور اسے سب خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔ کیا آپ کو اس سے انکار ہے؟ آپ خدا کے لئے سب کچھ کہئے لیکن اس گروہ کی باتیں مجھ سے نہ کیجئے، اگر آپ یہ کہیں کہ آفتاب مغرب سے نکل سکتا ہے تو مان لوں گا لیکن یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ اس طبقہ میں کوئی فرد صالح پیدا ہو سکتا ہے۔

(۶)

شیعہ سُنّی نزاع ——— قبلہ میر صاحب، تسلیم، یقیناً یہاں کی شیعہ سُنّی نزاع صد درجہ تکلیف دہ ہے لیکن میں اسے بھی ڈیماکریسی کا کرشمہ سمجھتا ہوں۔

والٹیر کہتا ہے:۔

"یوں اگر تم کوئی بات میرے خلاف کہو تو شاید میں خاموش رہوں گا، لیکن اگر تم نے یہ کہدیا کہ تمھیں ایسا کہنے کا حق حاصل ہے تو میں اپنی جان دیدوں گا"

اس وقت نہ سوال ابوبکر و علی کا ہے، نہ خلافت و امامت کا بلکہ صرف اس بات کا کہ ایک فریق ایک بات کو اپنا حق کہکر تسلیم کرانا چاہتا ہے اور دوسرا اسے نہیں مانتا۔

میرے نزدیک یہ سب زندگی کی علامتیں ہیں اگر تمام مسلمان من حیث القوم کچھ نہیں کر سکتے تو من حیث العقیدہ سہی کسی ایک کو تو اُبھرنے دیجئے۔ نہ اب مدح صحابہ کوئی وزن رکھتی ہے نہ تبرا، معنوی حیثیت سے دونوں لغو ہیں لیکن اگر اس بہانہ سے ان میں کوئی احساس زندگی پیدا ہوتا ہے تو کیا حرج ہے۔ دونوں کو لڑنے دیجئے اگر کوئی ایک بھی سنبھل گیا تو محنت

وصول ہوگئی ورنہ تباہ ہونا تو اس قوم کی قسمت میں لکھا ہی ہے، آج نہ سہی کل، سیاسی گمراہی نہ سہی مذہبی گمراہی سہی، ایک ہی بات ہے:

(۷)

حشر و نشر ——— قبلۂ محترم، بڑی مشکل آپڑتی ہے جب کسی سے دل کی بات چھپائے نہ بنے اور وہ پوچھ بیٹھے۔ رہا اصل معاملہ، سو بقول داغ :-

اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے ادھر آج

یعنی وہ خدا کا معاملہ "فردا" پر اُٹھا رکھتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ خدا نام ہے صرف "آج" کا بلکہ اُس لمحہ کا جو اسوقت گزر رہا ہے یعنی فردا عدم محض ہے اور اس کا وجود "آج" ہی کی صورت میں محقق ہو سکتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا فیصلہ اس باب میں کیا ہوگا لیکن، جو کچھ بھی ہو مجھے اسی دُنیا میں جان دینا ہے اور پھر اُٹھنا نہیں جنھیں حشر و نشر کا سو قیانہ ہنگامہ گوارا ہو وہ اس کی تمنا کریں، حوروں کی آرزو کیا کروں، جانتا ہوں کہ من و سلویٰ کھانے والے بھی پیاز لہسن پر اُتر آئے تھے، سونے چاندی کے مکان وہاں ملے بھی تو کس کام کے جب کہ اس کی ایک اینٹ بھی فروخت کرکے یورپ جانے کے لئے ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ رزرو نہیں کرا سکتا، رہ گئے پھل سو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہاں یونہی نزلہ زکام کا زور رہتا ہے چہ جائیکہ اس پر پھلوں کی بھرمار جو "سریع الاستحالہ" ہونے کی وجہ سے فوراً خلط غالب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ فردوس کا ٹمپریچر کیا ہوگا، کہا جاتا ہے کہ وہاں ہر وقت صبح صادق کا سا سماں نظر آئے گا، لیکن کس موسم کی صبح صادق اور کس ملک کا موسم؟ اگر سرزمین عرب کو معیار قرار دیا جائے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کے کسی موسم کی صبح صادق ایسی ہو سکتی ہے جو دُنیا کے ہر شخص کے لئے موزوں ہو۔

قطب شمالی کی بسنے والی قوم (اسکیمو) کے سامنے آپ جہنم کی بڑھتی ہوئی گرمی کا ذکر کریں گے تو وہ قصداً گناہ کرکے وہیں جائے گی اور اگر فردوس کے موسم میں بڑا اعتدال پیدا کرکے آپ اسے شربتی کے انگرکھے تک کھینچ لائیے تو سویڈن و ناروے کے جنتی کے لئے وہ دوزخ سے بھی بدتر ہوگا۔

خدا کو اگر جنت دوزخ بنانا ہوتی تو ساری دُنیا کا موسم اور سب کا ذوق ایک ہی رکھتا پھر اگر یہ نہیں ہے تو وہ بھی نہیں۔ انھیں دشواریوں کو دیکھ کر مولوی کہتے ہیں کہ جنت میں سب ایک عمر، ایک ذوق اور ایک رجحان کے ہوں گے صورت غالباً اس لئے ایک، نہیں بتائی کہ حوروں کو دھوکا ہو جاتا۔ بہر حال حشر و نشر کے عقیدہ کے ساتھ یہ طومار بندی میرے بس کی چیز نہیں۔ میں تو مر کے خدا کو کسی جھگڑے میں ڈالنا پسند نہیں کرتا، اور اگر حشر و نشر نہ کر کے بھی خدا رہ سکتا ہے تو ہم کیوں اسے کسی زحمت میں مبتلا کریں۔

آپ ہنسئے نہیں، ذرا غور کرکے بتائیے کہ یہ ہے کیا؟

(۸)

کفر و اسلام ——— حضرت محترم - کتاب پہونچی، سرسری نگاہ سے دیکھنا اس کی توہین ہے اور تفصیلی مطالعہ و استفادہ کی فرصت شاید ابھی چند دن اور میسر نہ آئے، لیکن آپ کو جاننے والا سمجھ سکتا ہے کہ یہ تصنیف کتنی پاکیزہ ہوگی۔

آپ نے جس موضوع کو لیا ہے وہ نیا نہیں۔ لیکن جو پہلو بحث کا آپ نے لیا ہے کیا وہ بالکل نئی چیز ہے، اسی کو ماہرانہ بصیرت اور عالمانہ ہورک کہتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ میں صرف اسی مذہب کا قایل ہوں جو غیر فطری اور غیر ضروری این و آں سے بلند ہو کر محض "انسانیت" کی پرستش کا درس دُنیا کو دے اور اگر یہ مقصد "لامذہبیت" سے حاصل ہو سکتا ہے تو میرے نزدیک یہی بہترین مذہب ہے۔

تصوف ہمیشہ میری پریشان خیالی کی جائے پناہ رہا ہے، لیکن اس کا علمی یا فلسفیانہ پہلو نہیں جس میں "لطائف قلب" یا "حقیقت و معرفت" وغیرہ کی اصطلاحوں سے بحث کی جاتی ہے بلکہ اس کا اخلاقی پہلو، اس کا والہانہ مشرب، اس کا نعرہ "ہمہ اوست" اس کا آوازۂ "پندارم توئی" کہ اگر آپ عملی زندگی میں اس کی تفسیر کریں تو نتیجہ وہی "انسانیت پرستی" نکلتا ہے۔

محبت کا بندہ ہوں، محبت ہی کی آواز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے اور میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آسکتی کہ خدا آپ کا ہو سکتا ہے میرا نہیں، حرم بھی اسی کا، دیر بھی اسی کا، اذان میں بھی اسی کی پکار ہے، ناقوس میں بھی اسی کی چہکار ہے، "ضلالت و گمرہی"، "رشد و نجات"، ہماری وضع کی ہوئی اصطلاحیں ہیں، وہ ان سب سے بلند ہے، مذاہب نے حقیقی خدا کی حقیقت کو کبھی نہیں سمجھا، بلکہ مذہبی ایک خدا وضع کیا اور اس کے حدود دُنیا کے سامنے پیش کئے، یہ سب خدا کا "انسانی تصور" ہے، خدا نہیں۔ میں آپ کو بتاؤں مجھے اصطلاحی مذہب سے کیوں نفرت پیدا ہوئی۔

ایک دن مجھے نہایت ضعیف عورت نظر آئی جو دھوپ میں بیٹھی ہوئی پتھر توڑ رہی تھی، میں نے اُسے بلا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ بہت کمسنی میں اس کے والدین کا انتقال ہو گیا، شادی کے بعد اس کے شوہر نے چھوڑ دیا، اس کے دو بیٹے تھے جن کو مزدوری کر کر کے اس نے پالا، بڑا کیا، لیکن وہ بھی جوان ہو کر طاعون میں مر گئے، اب پورے بیس سال سے اس کی زندگی یہ ہے کہ پتھر توڑ توڑ کر آنے دو آنے پیدا کرتی ہے اور جہاں جگہ مل جاتی ہے پڑ رہتی ہے۔

اس کے ہاتھ اس قدر کمزور تھے کہ ہتھوڑا بھی نہ سنبھال سکتی تھی اور بینائی اتنی ضعیف ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی بجائے پتھر کے وہ اپنے ہاتھ کو زخمی کر لیتی تھی، بدن پر کپڑے، تو خیر کیا، کپڑے کے کچھ تار تھے جن کے اندر سے اس کے جسم کی جھریاں نظر آتی تھیں، میں نے اس کی قومیت پوچھی تو معلوم ہوا کہ "تیلن" ہے۔

یہ سنتے ہی میرے سامنے مسلمانوں کا یہ عقیدہ سامنے آیا کہ "جو مسلمان نہیں اُسے اُخروی نجات نہیں مل سکتی" اسی کے ساتھ خیال آیا کہ کیا واقعی خدا اس عورت کو جہنم میں ڈال دے گا! میں ایسے خدا کے خیال سے کانپ اُٹھا، اسلام کے اس ظالمانہ فیصلہ کی طرف سے میرے دل میں کراہت سی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ اسلام کی حقیقت کچھ اور ہونی چاہئے ایک فطری مذہب، خدا کا ایسا بُرا تصور کبھی پیش نہیں کر سکتا کہ ایک بڑھیا جس کی ساری عمر انتہائی تکلیف میں گزری ہو، جس کے ماحول نے اسے ایک جانور کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہو، جس کی بے دست و پائی نے کبھی اس بات کا موقعہ نہ دیا ہو وہ دنیا میں کسی کو ستا سکے، بلکہ ہمیشہ وہی ستائی گئی ہو اور وہ محض اس تصور پر جہنم میں ڈال دی جائے کہ اس نے اصول اسلام کے مطابق خدا کو نہیں مانا تھا، اس کی ساری زندگی اس بات سے خالی الذہن ہو کر بسر ہوئی کہ خدا کیا اور مذہب کیسا اس کو اپنی مصیبتوں سے کبھی نجات ہی نہیں ملی کہ وہ "مصیبتوں سے نجات دلانے والے خدا" کا شکریہ ادا کر سکتی لیکن اسلام

کا فتویٰ یہ ہے کہ اسے ضرور جہنم میں ڈالا جائے گا کیونکہ وہ ایک بُت پرست ہندو خاندان میں پیدا ہوئی اور اسلام کی روشنی سے فایدہ نہیں اُٹھایا۔

اس کے بعد میں سوچنے لگا کہ ہندو خاندان میں پیدا کرنے والا اور اس کے ماحول کو اسلام سے دور رکھنے والا کوئی خدا اور تھا؟ کیا ایسی قوت جو ساری عمر ایک ایک دانہ کو محتاج رکھے اور مرنے کے بعد بھی آگ میں جھونک دے، واقعی خدا کہلانے کے قابل ہے؟ کیا خدا انسانوں کا سا احساس رکھتا ہے، کیا واقعی اسے تکلیف ہوتی ہے اگر کوئی اسے نہ مانے، کیا وہ سچ مچ خوش ہوتا ہے اگر کوئی اس کی پوجا کرے، کیا واقعی اس میں جذبۂ غیظ و انتقام پایا جاتا ہے، کیا اتنی بڑی کائنات کا پیدا کرنے والا اس قدر پست و دنی ہو سکتا ہے کہ وہ اس بڑھیا کو جہنم میں ڈال دے صرف اس خطا پر کہ اسے مسلمان ہونے کا کوئی موقع نہ ملا تھا۔ کیا وہ سوا مسلمانوں کے اور تمام دُنیا کے انسانوں سے جو یقیناً مسلمانوں سے تعداد میں بہت زیادہ ہیں ناراض ہے، کیا وہ ان سب کو دوزخ کی آگ میں ڈال دے گا۔ کیا یہ کوئی بڑی عمدہ بات ہے کہ وہ اپنے تمام بندوں کو صرف مسلمانوں کی خوشنودی کے لئے ہمیشہ عذاب میں مبتلا رکھے، اسے کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ جہنم کی ایندھن بننے والی مخلوق اتنی تعداد میں پیدا کرے، اس سے کس نے کہا تھا کہ وہ انسان پیدا کرے بھی تو اس قدر "مجبورِ ماحول" کہ خود اس کے اختیار میں کچھ نہ ہو، کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ سب کو مسلمان پیدا کرتا، کیا یہ اس کی قوت سے باہر تھا کہ دُنیا میں ہر شخص کو اسلام کی برکات سے فایدہ اُٹھانے کا موقعہ دیتا؟ پھر اگر ایسا نہیں ہے تو اس میں انسان کی کیا غلطی ہے اور وہ کیوں اس جُرم کی پاداش میں پکڑا جائے جس کے کرنے پر وہ مجبور تھا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے خیالات تھے، جنھوں نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ خدا کا وہ تصور جو عام طور پر مسلمانوں کے دلوں میں قایم ہے صحیح نہیں ہو سکتا اور اسی وقت سے میری روح میں اضطراب برپا ہے جو کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا۔ میں قومیت کے لحاظ سے بے شک مسلمان ہوں اور اسلام کے بتائے ہوئے اصول کو بھی اچھا سمجھتا ہوں لیکن اسلام کے اس عقیدہ کو کبھی نہیں مان سکتا کہ سوا مسلمانوں کے سب گمراہ ہیں اور اُخروی نجات سے محروم!

تصوف سے مجھے سکون ہوتا ہے اور صرف اس لئے کہ وہ خدا کے ٹکڑے نہیں کرتا۔ اس کے ہاں، ہندو مسلمان، گبرو ترسا، یہود و نصاریٰ، سب کا خدا ایک ہی ہے اور بہت مہربان خُدا ہے۔

اورنگ زیب سیاسی حیثیت سے کتنا ہی قابل ستایش بادشاہ رہا ہو لیکن اخلاقی دُنیا کا بادشاہ داراشکوہ تھا اور میں بھی اس کی طرح اس مشرب کا قایل ہوں کہ:-

کفر و اسلام در رہش پویاں
وحدہ لاالٰہ لہ گویاں

اگر آپ نے اپنی کتاب میں بھی اس پہلو کو سامنے رکھ کر بحث کی ہے تو میرے نزدیک صحیفۂ آسمانی ہے، لیکن اگر آپ صرف اصطلاحات تصوف میں اُلجھ گئے ہیں تو میں اسے دیکھ کر کیا کروں گا۔

(۹)

اسلام اور تصویر کشی —— اگر تم اس باب میں کوئی فتویٰ حاصل کرنا چاہتے ہو تو مولویوں سے پوچھو، رہی میری

ذاتی رائے سو وہ تم کو معلوم ہی ہے ۔

میں جانتا ہی ہوں یہ لوگ کیا کہیں گے ۔ ایک کی رائے ہوگی تصویر کھنچوانا بہرصورت ممنوع ہے (اور یہ رائے اس کی ہوگی، جس کی صورت واقعی اس قابل نہیں کہ تصویر لی جائے) دوسرا کہے گا کہ نیم رخی (PROFILE) تصویر میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس طرح نقش میں تجسیم کا رنگ پیدا نہیں ہوتا (لیکن یہ قول اس کا ہوگا جو اس آرٹ سے بالکل ناواقف ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ "تجسیم" کی کیفیت نیم رخی تصویر ہی سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے) تیسرا کہے گا کہ نصف دھڑ (BUST) کی تصویر جائز ہے، کیونکہ اس طرح پورا جسم سامنے نہیں آتا (اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کے نزدیک خطرہ صرف نیچے کے دھڑ میں ہے اور دل و دماغ بیکار چیزیں ہیں) ۔

الغرض تمام دوسرے مسایل کی طرح اس میں بھی کوئی متفقہ فتویٰ آپ کو نہ مل سکے گا، اس لئے میری رائے میں آپ خود اپنی عقل سے کام لیجئے، ہر حکم کا کوئی نہ کوئی سبب ہوا کرتا ہے ۔ اسلام چونکہ بت پرستی کا مخالف ہے اس لئے اس نے کسی ایسے فعل کی اجازت نہیں دی جس میں ہلکا سا امکان بھی بت پرستی کی طرف مایل ہو جانے کا پایا جائے اور اسی لئے اس نے مجسمہ سازی کی اجازت نہیں دی ۔ تصویر کشی کا رواج اس وقت عام نہ تھا کہ اس پر غور کیا جاتا، بعد کو جب تصویر کا رواج ہوا تو اس پر غور ہوا اور جواز و عدم جواز کی مختلف صورتیں پیدا کی گئیں، حالانکہ در اصل، یہ زمانہ اس قسم کی بحثوں کا ہے ہی نہیں یعنی اب مجسمہ سازی کے لئے بھی علت حرمت باقی نہیں رہی، تصویر کا کیا ذکر ہے ۔

جس حد تک اہل علم کا تعلق ہے بت پرستی کا دور بالکل ختم ہو چکا ہے (ہندو و مسلمان دونوں کے لئے) رہے جاہل، سو ان کے لئے مجسمہ، تصویر، پیپل، مزار، سب یکساں ہیں ۔ تم کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں ایک جماعت صوفیہ کی ایسی بھی ہے جو اپنے پیر طریقت کی تصویر سامنے رکھ کر اس کے سامنے سجدہ کرتی ہے اور انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ تصویر کیسی ہے پھر ان کے لئے تو تصویر مطلقاً حرام ہونی چاہئے، لیکن سوا اپنے پیر کے سب کی !

ان کے برخلاف اہل فن کی جماعت کو لو، جو تصویر کیا اچھے خاصے بت بناتی ہے، لیکن اس کا مقصود صرف فن کی تکمیل ہوتا ہے تو کیا ان کے لئے مجسمہ سازی حرام قرار دی جائے گی ؟

یہ انتہائی کج فہمی ہے کہ کسی قانون یا شریعت کے کسی حکم کو دائمی چیز سمجھا جائے ۔ قانون، وقت، ضرورت اور مصلحت کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک کے بدل جانے پر قانون میں بھی تغیر و تبدل ضروری ہو جاتا ہے ۔

جس وقت اسلام نے مجسمہ سازی کی مخالفت کی، یہ وہ زمانہ تھا جب عرب میں بت پرستی کا رواج فنی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بکثرت پایا جاتا تھا اور اس رواج نے اُن کے قواء ذہنیہ کو مضمحل کر رکھا تھا خیال تھا کہ اگر بت سازی سے باز نہ رکھا گیا تو اس مذموم عادت کا استیصال نہ ہو سکے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس وقت بھی کوئی مسلمان ایسا ہے جو محض مجسمہ سازی یا تصویر کشی کی وجہ سے بت پرستی اختیار کر سکتا ہے ؟

پھر جب اس کا امکان نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ حکم اس وقت بھی قابل عمل قرار پائے اور اس کو کالعدم نہ سمجھا جائے ۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خدشہ تمھارے دل میں پیدا ہی کیوں ہوا ؟ کوئی اچھی شکل و صورت والا انسان اگر تصویر کھنچوائے تو اسے خیال کرنا چاہئے کہ کہیں لوگ اسے پوجنے نہ لگیں، تمھیں کیا ڈر ہے ۔

(۱۰)

فلسفۂ نماز ـــــ نماز شروع کر دی، اچھا کیا، خدا مبارک کرے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس مرتبہ کون سا شکار پیش نظر ہے، اُس مرتبہ تم نے نماز کی پابندی کی تو غریب منیر کو تباہ کر دیا، اور وضو کراتے کراتے اس کے چہرہ کو اچھا خاصا "تیمم گاہ" بنا دیا، اس مرتبہ نظرِ عنایت کس پر ہے۔ خدا بچائے ان پیرزادوں سے کہ یہ عبد ہو کر بھی معبود ہی بنے رہتے ہیں۔ میرا فلسفۂ نماز خواہ کتنا ہی ناقابلِ عمل ہو لیکن اس کے بلند ہونے سے تمھیں بھی انکار نہیں، پھر یہ جو تم نمازیں پڑھتے ہو صرف گناہ کرنے کے لئے، عبادتیں کرتے ہو محض کارگاہ ارادت کو وسیع کرنے کی غرض سے، تو خدا کے لئے بتاؤ کیا اس نشست و برخاست کے علاوہ کوئی اور نسخہ تمھیں معلوم نہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا لغو حرکت ہے۔ گناہ کرتے ہو تو گناہ کرنے والوں کی سی صورت بھی بناؤ۔ اس سے کیا فایدہ کہ مسجد میں سجدہ کر کر کے جو خاک اپنی پیشانی پر اُٹھاؤ اُسے کسی آنچل سے صاف کرتے پھرو۔

اس میں شک نہیں کہ عبادت کا یہ ڈھنگ کسی کو آجائے تو دُنیا میں اس سے زیادہ بہتر مشغلہ اور کیا ہو سکتا ہے مگر یہ معاملہ تو "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" کا ہے ـــــ سعی و کوشش سے بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ "غریب تیر مر رہے"۔

(۱۱)

درسِ روحانیت و اخلاق ـــــ کرم گسترا ـــــ رہبری کا شکریہ، لیکن کیا کروں میری گمراہی تو سکندر کی سی گمراہی ہے کہ خضر بھی "آبِ حیوان" تک پہونچانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ میں آپ کی ہدایت پر ایک سے زاید بار ان کی صحبت "مراقبہ و سلوک" میں شریک ہو چکا ہوں، گھنٹوں سر جھکائے رہنے کے بعد گردن میں درد تو ضرور پیدا ہو گیا، لیکن دل پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ "حضرت" کی صورت ہی مجھے اچھی معلوم ہونے لگتی! ۔ فرمایا ـــــ کیا چاہتے ہو؟ ـــــ میں نے جواب دیا۔ "روحانیت" ـــــ بولے ـــــ "روحانیت سے کیا مراد ہے؟"

میں نے کہا ـــــ "بادہ خواری کی توفیق اور گناہ کرنے کی اہلیت!" قریب تھا کہ گردن میں ہاتھ دے کر مجھے نکال دیتے لیکن میں نے کہا ـــــ "جناب غصّے کی کوئی بات نہیں، جب روحانیت کا مفہوم خود آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں تو سوا اس کے کیا عرض کروں۔ میں تو آپ کے پاس خود یہی سوال لے کر آیا ہوں اور آپ اُلٹا مجھ ہی سے دریافت کرتے ہیں" یہ سُن کر خیر غصّہ تو کیا کم ہوتا لیکن ایک حد تک ضبط پر قادر ہو گئے اور فرمایا ـــــ "پھر بھی تمھارے نزدیک کوئی نہ کوئی مفہوم روحانیت کا ہوگا، وہی معلوم کرنا چاہتا ہوں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میرے نزدیک روحانیت نام ہے صرف پاکیزہ اخلاق کا"۔ دریافت فرمایا ـــــ "کوئی مثال دو" ـــــ میں نے جواب دیا ـــــ "مثلاً گاندھی جی" ـــــ اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ یہ سُن کر کیا حال ہوا۔ ایک ایک زبان میں ہزار ہزار گالیاں مجھے اور لاکھ لاکھ غریب گاندھی کو دے ڈالیں۔ میں نہایت خاموشی سے سُنتا رہا اور جب وہ کامل آدھ گھنٹے تک گلفشانیاں ختم کرنے کے بعد خاموش ہوئے تو میں نے کہا ـــــ "بہتر ہے میں رخصت ہوتا ہوں کیونکہ پہلا درس اخلاق تو آپ کی طرف سے آج ختم ہو گیا، اگر اس سے جاں بر ہو گیا تو پھر حاضر ہوں گا، ورنہ غالباً نجات کے لئے اسی قدر کافی ہے"۔

(۱۲)

گناہ درویشی ـــــ حضرت قبلہ، یہ جو آپ نے خواہ مخواہ دردِ سر مول لے رکھا ہے میں پوچھتا ہوں اس سے فایدہ کیا ہے؟

مانا کہ یہ سب کچھ فرض ہے، لیکن اس کے کیا معنی کہ خود آپ اپنی زندگی کے فرائض بھول کر بیوی بچوں سے بیزار ہو جائیں۔ خدا کے لئے بتائیے، یہ کہاں کا مذہب ہے، یہ کیسا تصوف ہے۔

صبح جائیے تو معلوم ہو کہ شاہ صاحب کے یہاں ختم خواجگان میں شرکت کے لئے گئے ہوئے ہیں، دوپہر کو ڈھونڈھئے تو خبر ملے کہ ابھی تک نہیں آئے۔ پیر جی کے پاؤں داب رہے ہیں، شام کو تلاش کیجئے تو پتہ چلے، مراقبہ میں توجہ لے رہے ہیں، رات کو تو خیر انوار ربانی کے حصول کے لئے پیر و مرشد کے ساتھ شب زندہ داری گویا فرض ہی ٹھہری۔ میں پوچھتا ہوں کیا دماغ خراب ہو گیا ہے، یا تمہارے پیر نے کوئی افسوں پھونک دیا ہے جو اپنے بچوں کی محبت بھی تم میں باقی نہیں رہی، تم اپنے پیر کے ساتھ فاقہ کرو جو جی میں آئے جھک مارتے رہو، اپنے متعلقین کو کیوں بھوکا مارتے ہو۔ تیس روپئے تو آپ کی تنخواہ ہے اس پر یہ غیر حاضریاں، پھر آپ ہی بتائیے کہ اس مہینے میں جو صرف دس روپے آپ کو ملے ہیں ان میں آپ کے بیوی بچوں کے کھانے کپڑے کا انتظام کیا جائے یا اس مہاجن کی قسط ادا کی جائے جس سے قرض لے کر آپ نے "خانقاہ شریف" کی مسجد کا کنواں کھدوایا ہے۔

یاد رکھو! کہ یہ جنت کی لالچ دلا دلا کر رات بھر تم سے پاؤں دبوانے والے، دن دن بھر غلام کی طرح تم سے کام لینے والے، مذہب کے دشمن ہیں، احمق! مذہب نام ہے صرف ان حقوق کے ادا کرنے کا جو بحیثیت متمدن انسان ہونے کے تم پر عاید ہوتے ہیں اور سب سے پہلے جن کے حقوق تم کو ادا کرنا ہیں وہ تمہارے بچے ہیں، یہ تمہارا پیر جیتے ہی جی اسی دنیا میں تمہیں جہنم واصل نہ کر دے تو سہی۔ خیر چند دن اور دیکھتا ہوں، اس کے بعد تم سے تو خیر کچھ نہ کہوں گا، لیکن تمہارے پیر کو بتاؤں گا جس نے ایک شریف عورت کو شوہر کے ہوتے ہوئے بیوہ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو باپ کی زندگی ہی میں یتیم بنا دیا۔

(۱۴۳)

کفو کا مفہوم ——— ہر چند شادی کوئی اچھی چیز نہیں، مگر آپ ضرور کیجئے، کیونکہ اگر یہ حرکت آپ نے نہ کی تو کوئی اور اس سے زیادہ خراب حرکت کر بیٹھیں گے مگر یہ خیال رہے کہ آپ شادی کر رہے ہیں، عیاشی نہیں، "بیوی" کا تعلق "جذبۂ شہوانی" سے اتنا نہیں ہے جتنا "مصلحت عمرانی" سے ہے اس کا صاحب حسن و جمال ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا خوش خصال ہونا۔ لیکن مجھے معلوم ہے آپ میری اس نصیحت کی مطلقاً پروا نہ کریں گے اور "ضرورت شادی" کا جو اشتہار دیں گے تو اس میں سب سے پہلی شرط "جمیل و طرحدار" ہونے کی درج ہوگی حالانکہ آپ خود اس لحاظ سے ماشاء اللہ صفر ہی صفر ہیں ـــ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ ایک معمولی صورت کا مرد کیوں یہ خواہش کرتا ہے کہ عورت اُسے نہایت طرحدار ملے ـــــ اور پھر یہ کہ وہ اس سے محبت بھی کرے۔ آؤ میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں مگر کسی مولوی سے نہ کہہ دینا۔ یہ جو مذہب اسلام میں کفو کے درمیان شادی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، اس کا مفہوم سب لوگ غلط سمجھتے ہیں، کفو سے یہ لوگ خاندان یا برادری مراد لیتے ہیں درانحالیکہ کفو کے معنی مماثل کے ہیں۔

مماثل کیا؟ یعنی جو لوگ تہذیب و شرافت، تعلیم و تربیت، سیرت و صورت میں باہم گر مماثل ہیں ان میں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج قایم ہونا چاہئے پھر اس کے لئے خاندان یا برادری کی قید بیکار ہے، فرض کیجئے خاندان میں ایک لڑکی ہے

لیکن اپنے صفات کے لحاظ سے وہ ادنیٰ درجے کی ہے تو یقیناً کفو میں داخل نہ ہوگی، لیکن اگر کسی دوسرے خاندان کی ہے اور صورتاً و سیرتاً مماثل واقع ہوئی ہے تو کفو کہلائے گی۔ جنّت میں حوریں بدصورت مردوں کو گوارا کر لیں تو کر لیں لیکن اس دُنیا میں یہ ظلم زیادہ نبھنے والا نہیں، اس لئے یوں بھی آپ کو "حسن و جمال" کی جستجو کا حق حاصل نہیں، یقیناً آپ بدصورت نہیں لیکن اتنے طرحدار بھی نہیں کہ جیو پیپر کی بیٹی سے کم درجے کی عورت آپ کو پسند نہ آئے۔

(۱۴)

ذکرِ حج ——— نواب صاحب قبلہ!۔ میں نے سُنا ہے (یہ نہ بتاؤں گا کس سے) کہ آپ ماہ آیندہ سفرِ حج کا عزم رکھتے ہیں اور بر سبیل تذکرہ آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ کیا نیاز کا ساتھ چلنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے بعض نے صاف صاف یہ بھی کہدیا ہو کہ "آپ بھی کس کافرِ مشرک کا ذکر کرتے ہیں"۔

سو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نفسِ حج کا خیال اور وہ بھی کسی کی معیت میں، کسی کے طفیل میں کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا، رہا سوال سیر و سیاحت کا سو ایک عازمِ حج کے ساتھ اس کا بھی کوئی لطف نہیں، آپ چلیں گے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور یہاں عالم ہوگا "نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد" کا، آپ کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح و حمایل ہوگی اور یہاں جام و مینا، پھر آپ ہی بتائیے کہ اگر کسی صورت کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے سبحان اللہ نکل گیا اور ٹھیک اسی وقت آپ تسبیح پڑھنے لگے تو میں کیا کروں گا سوا اس کے کہ سمندر میں کود پڑوں ——— غرض یہ کہ آپ کے ساتھ چلنے کی کوئی صورت ممکن نہیں، ہاں، اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ بمبئی میں جہاز کے عرشہ پر مجھے گم کر کے پھر اس وقت تک میری جستجو نہ کریں گے جب تک آپ پھر بمبئی واپس نہ آجائیں، تو بے شک میں طیار ہو سکتا ہوں ——— مگر پوچھئے کہ یہ معیت ہی کب ہوئی؟

۱۵

تعویذ ——— جو حالات آپ نے لکھے ہیں اُن سے کھلا ہوا "اختناق الرحم" ظاہر ہو رہا ہے یوں آپ کی مرضی ہے کہ خواہ مخواہ دعا و تعویذ میں اپنا وقت اور بیوی کی صحت غارت کرتے رہیں، لیکن اگر خود انھیں کا اصرار ہے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ خود ان کی قوت ارادی کام کرے گی اور ممکن ہے اس سے فایدہ ہو جائے۔

ایک واقعہ خود میرے ذاتی تجربہ کا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اجے گڑھ میں تھا، دوپہر کو ایک آدمی "عظیمن" کا رقعہ لئے ہوئے آیا کہ تجاری کا تعویذ لکھ دیجئے، میں حیران کہ یہ قصّہ کیا ہے، جواب دے دیا کہ میں اس پیشے کا آدمی نہیں ہوں کس نے آپ سے کہدیا۔

اُدھر سے اصرار ہوا اور اِدھر سے انکار لیکن مجبوراً ایک تعویذ لکھ کر دیدیا کہ بازو پر باندھ لیا جائے۔ تعویذ کا بازو پر باندھنا تھا کہ بخار کافور ہو گیا۔ اب کیا پوچھتے ہیں آپ کیا ہنگامہ بپا ہوا، جشن و مسرت کا ایک سیلاب تھا جو اجے گڑھ کے ایک ایک ذرہ سے امنڈا پڑتا تھا، مہاراج (سر رنجور سنگھ) تک خبر پہونچی، مجھے یاد فرمایا اور کہا یہ کیا جادو تم نے کر دیا! عظیمن بھی مجوب سرنگوں انداز میں بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھیں، میں نے عرض کیا کہ "مہاراج تعویذ ہی ایسا تھا" ——— بولے ——— "مجھے بھی بتاؤ" ——— میں نے کہا ——— "آپ کو تو نہیں لیکن عظیمن اگر چاہیں تو بے شک بتا سکتا ہوں" ——— مہاراج نے ہنس کر عظیمن سے کہا کہ:- "کیوں کیا ارادہ ہے؟" بولیں "ضرور" ——— میں نے کہا کہ ——— "تعویذ اپنے بازو سے کھول کر دیجئے اور جو میں نے لکھا ہو

وہ آپ بھی لکھ کر دیدیا کیجئے لیکن میں اس کا ذمہ دار نہیں اگر آپ کو بخار آنے لگے"۔

بولیں :- "جی ہاں! میں یہ ساری چالیں سمجھتی ہوں، مدعا یہ کہ میں اسے کھول کر نہ دیکھوں اور یہ عمل مجھے نہ معلوم ہو سکے"۔ میں اُٹھا اور اُن کے بازو سے تعویذ علٰحدہ کر کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں صرف یہ مصرعہ لکھا ہوا تھا:-

نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست

اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ کس قدر قہقہہ پڑا۔

(۱۶)

عبادت و ریاضت —— میں پوچھتا ہوں کیا تم سے زیادہ پڑھا لکھا جاہل دُنیا میں کوئی اور بھی پیدا ہوا ہے؟ غضب خدا کا وہ تو اعصاب کی کمزوری، قلتِ خون اور دماغ کے تشنجی دوروں میں مبتلا ہے اور تم آسیب کا خلل جان کر دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔

مانا کہ تم مذہبی انسان ہو، کلام الٰہی میں بڑی قدرت ہے لیکن خدا کے لئے بتاؤ کہ یہ جو بات بات میں تم خدا کو تکلیف دیا کرتے ہو اس سے کیا نتیجہ —— کیا اللہ میاں کو سوا اس کے کوئی کام نہیں کہ وہ صرف تمہاری عبادت و ریاضت اور تمہارے ایمان و اسلام کو بیٹھے ہوئے سراہا کریں اور تم کو مرنے سے پہلے ہی دُنیا میں جنّت کی تمام راحتیں مہیا کر دیں۔

ہوش میں آؤ، زہد و تقویٰ بھی وقت وقت سے اچھا معلوم ہوتا ہے یہ نہیں کہ میاں کو چھینک آئی اور تسبیح پر ہاتھ پہونچ گیا سر میں درد ہوا اور مصلّےٰ بچھ گیا! - اللہ میاں کو توبہ توبہ کیا تم نے اپنا خانہ زاد غلام سمجھ لیا ہے جو بات بات میں تمہارے پیچھے دوڑتا پھرے گا۔ کیا دُنیا میں ہم سے گناہگار بندوں کی کمی ہے جو تم ایسے زاہدان عبوس کی طرف توجہ کرے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ تم عبادت و ریاضت چھوڑ دو یا میری طرح بے دین ہو جاؤ لیکن یہ کیا کہ :-

"زہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہید"

جب دیکھو نماز، جب سنو نماز —— نماز نہ ہوئی بلائے جان ہو گئی۔

۱۷

بندگی محبت —— نیاز نوازا! دین پناہا!

شکر نعمت ہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو

حج سے واپسی کی مبارکباد اس لئے پیش نہیں کرتا کہ "گنبدِ خضرا" کے جوار سے جدا ہو کر پھر اس تیرہ خاکدانِ ہند میں لوٹ آنا خود آپ کی تمنا کے بھی خلاف تھا لیکن ان مقدس تحایف کا شکریہ تو ضرور واجب ہے جو آپ خصوصیت کے ساتھ میرے لئے لائے ہیں۔

خاکِ شفاء اور ماءِ زمزم میں مٹّی اور پانی کے لحاظ سے کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن یہ خصوصیت کیا کم ہے کہ دیارِ حبیب کی چیزیں ہیں اور اُس سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں جہاں دوست آسودہ ہے۔

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

مولانا! میں تو کائنات میں صرف محبت کا قایل ہوں اور مذہب کے صرف اس حصہ پر ایمان رکھتا ہوں جو کسی نہ کسی پہلو سے "درسِ محبت" دینے والا ہے ——— خدا کے "جبار و قہار" ہونے کا ابھی تک کوئی مفہوم میرے ذہن میں نہیں آیا، صرف اس کی "شانِ کرم" پر جیتا ہوں اور وہ سب کچھ کر لیتا ہوں جس کا ذکر غالب نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

برلب یا علی سرائے بادہ روانہ کردہ ایم
مشربِ حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

(۱۸)

خدا و ترکِ دُنیا ——— ہوش کی باتیں کرو، خدا اگر چنگیز و ہلاکو نہیں تو حاتم طائی اور جعفر برمکی بھی نہیں! — نہ اس کو تمہاری عبادت کی پروا، نہ میری سرکشی کی، یہ تم سے کس نے کہدیا کہ وہ تمہارے سجدہ کرنے سے خوش ہوتا ہے اور میری شراب خواری سے پیشانی پر شکنیں ڈال لیتا ہے، عجیب آدمی ہو،

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہد ہم چو توئی یا زفسق ہم چو منی

نہ تم نمازیں پڑھ پڑھ کر کوئی بتکدہ مسمار کر سکتے ہو اور نہ میں اپنی بت پرستیوں سے کعبہ ڈھا سکتا ہوں، اس دربار میں نہ جنید و شبلی کے لئے خاص رعایت ہے نہ بہرام و جمشید سے کوئی عداوت - چند دن کی زندگی کو اس کوفت میں بسر کر دینا کہ معلوم نہیں حشر میں کیا معاملہ ہو، سخت نادانی ہے، کسی کا نہ دل دکھاؤ اور جو جی میں آئے کرو،

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن

تم نے دُنیا ترک کر دی بُرا کیا۔ دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیتے ہو اور زیادہ بُرا کرتے ہو، تم نا اہل و بزدل ہو تو ساری دُنیا کو کیوں ایسا سمجھتے ہو۔ تم چاہتے تھے کہ رندی و بادہ آشامی کی حقیقتیں اس قدر آسانی سے تم پر کھل جاتیں! معقول!!

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

۱۹-

خدا کا صحیح تصور ——— مولانا و مرشدنا! ——— مکرمت نامہ کا شکریہ، یوں تو آپ کی محبت کا ہمیشہ سے میرے دل پر نہایت گہرا نقش قایم ہے، لیکن اب آپ کی بزرگانہ نصیحت نے کچھ اور اضافہ اس میں کر دیا۔

قبلۂ عالم! آپ لاکھ سمجھائیے، یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہ آئے گی کہ خدا صرف مسلمانوں کا ہے اور سوا ان کے سب کو جہنم میں پھینک دے گا۔ ظہور اسلام سے لے کر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دو چار ارب مسلمان پیدا ہوئے ہوں گے اور ان کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ اور مذاہب کے لوگ پھر کیا کوئی ذی عقل باور کر سکتا ہے کہ خدا ایک کو جنت دے اور ہزار کو دوزخ میں جلائے — اس کو اتنے جہنمی پیدا کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی، اور اتنی مخلوق کو جن میں خدا جانے کتنی حسین عورتیں ہوں گی، آگ میں ڈال کر تڑپانے سے خدا کی کون سی مسرت وابستہ ہے۔

آپ کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اس کی مرضی، اور میرے پاس بھی اس کے خلاف ایک ہی

احتجاج ہے کہ:-

یارب زسیلِ حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بُت خانہ کہ خانقہش نام کردہ اند

(۲۰)

شانِ رندی ——— کرم فرمائے بندہ!- گرامی نامہ جس کو پند نامۂ فریدالدین عطار کہنا زیادہ موزوں ہے، ملا۔
حضرت یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کس خیال میں ہیں یہ سوئے ظن اور میرے متعلق! آہ!

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

آپ کو معلوم نہیں کہ جس طرح ہر صدی میں ایک مجدّد پیدا ہوا کرتا ہے اسی طرح ہر سو سال کے بعد ایک رند پیدا ہوتا ہے سو مجدّد کا حال تو آپ کو معلوم ہوگا، اور ممکن ہے کہ آپ ہی ہوں، لیکن اس صدی کے رند کی بابت مجھ سے پوچھئے کہ کون ہے؟ ہرچند خود ستائی ہوگی لیکن آپ اصرار کریں گے تو صاف صاف کہنا ہی پڑے گا۔

پھر آپ ہی غور فرمائیے کہ آپ کا یہ تمام "دفتر تدبیر و مصلحت" کیا کام دے سکتا ہے اور آپ کی مجدّدانہ ترشیاں نشہ کیا اُتار سکتی ہیں، جہاں اگر کبھی ترک معصیت کا خیال بھی ذہن میں آگیا تو اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے:-

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

نمازیں پڑھتے رہئے اور فرشتے بنے رہئے، ہم لوگوں کو چھیڑنے سے فائدہ کہ اگر آزادی سے ایک سانس بھی آپ کے سامنے لی تو بادۂ دوشینہ کی بو سے آپ کو بھاگنے کی راہ نہ ملے گی، ہم لوگ رند ہیں رند! سُنا آپ نے؟

(۲۱)

فلسفۂ ازدواج ——— یہ جو تمام دنیا میں ۳۰ سال تک خستہ و خوار پھرنے کے بعد آپ کو گھر بسانے کا سودا ہوا ہے سو کیوں اگر "شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہے" تو پھر قاتل کی جستجو کیوں اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر اس وقت تک جو کرتے رہے ہو وہی اب بھی کرو، دم کیوں نکلا جا رہا ہے، ہاتھ پاؤں کیوں ڈھیلے ہوئے جا رہے ہیں؟

آپ نے جو شرائط شادی پیش کئے ہیں وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہیں یعنی آپ کو ایک ایسی عورت چاہئے جو حُسن میں کوہ قاف کی پری ہو اور دولت میں راکفلر یا فورڈ کی بیٹی ——— خیال اچھا ہے کیونکہ تم بھی تو اپنی بدشوقی یا مفلسی میں جواب نہیں رکھتے، ہوش میں آؤ، کیوں دماغ خراب ہوا ہے، اول تو ایسی عورت ملنا محال ہے اور اگر مل بھی گئی تو وہ مجھے چھوڑ کر تمھارے پاس کیوں جانے لگی، یاد رکھو بدصورت مرد کے لئے حسین بیوی سے زیادہ دُنیا میں کوئی عذاب نہیں، اگر اس کو تم سے محبت نہ ہوئی (اور محبت ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو اس عذاب میں مبتلا رہو گے کہ خدا جانے کب تمھیں چھوڑ بیٹھے اور اگر محبت ہوگئی تو ہمیشہ اس کے غلام بنے رہو گے، کیونکہ یہی ایک صورت تمھارے لئے اعتراف محبت کی ہوسکتی ہے۔

اگر آزادی ایسی ہی ناگوار ہے تو کوئی عورت معمولی شکل و صورت کی ڈھونڈو، جو تمہاری قدر کرے اور تمہارے آئینہ میں اپنا بھی منہ دیکھ سکے۔ جھونپڑے میں رہنا اور محلوں کا خواب دیکھنا سراسر حماقت ہے۔

(۲۲)

لکم دینکم ولی دین ——— کرم فرمائے بندہ!۔ کل جعفر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ میری طرف سے بر سر شکایت ہیں۔ خیر یہاں تک تو کوئی مضایقہ نہ تھا، لیکن سنا گیا ہے کہ آپ نے مجمع احباب میں بعض ایسے الفاظ سے بھی یاد کیا جو تہذیب سے یکسر بیگانہ تھے، حیرت ہے کہ آپ نے کیوں اس قدر التفات فراواں سے کام لیا۔

آپ میرے بزرگ ہیں، میرے بزرگوں کے ملنے والے ہیں۔ حسنی الحسینی ہیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں سوا اس کے کہ اس وقت تو میں اپنے آپ کو ایسا مکار فریبی نہیں سمجھتا تھا لیکن اب چونکہ آپ ایسا فرماتے ہیں اس لئے ویسا بن جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریبند و فسوس
سعدیا آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

چونکہ جناب کی اس توجہ کا شکریہ لازم تھا اس لئے یہ چند سطریں سپرد قلم کی گئیں ورنہ اس سے منشا حاشا وکلا یہ ظاہر کرنا نہیں کہ میں کچھ اصلاح کی طرف مایل ہو گیا ہوں یا یہ کہ آپ کی بد دعاؤں نے مجھے مآل کی طرف سے خائف بنا دیا ہے، یہاں تو جو بے راہ روی اول دن اختیار کر لی تھی بحمد اللہ وہی اب تک قایم ہے۔

آپ کے مذہب و ایقان کی بلندی سے ناواقف نہیں لیکن اپنے متعلق کس زبان سے عرض کروں کہ:۔

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم

لکم دینکم ولی دین۔

(۲۳)

گناہ و توبہ ——— شیخ صاحب!۔ واللہ آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں۔ میں نے توبہ ہی کب کی تھی کہ توبہ توڑنے کا الزام مجھ پر قایم کیا جائے، مجھے معلوم تو ہو کہ یہ آپ سے کہا کس نے۔

بہرحال آپ مطمئن رہئے کہ اگر "خونِ دل" پینے کا نام آپ کے یہاں بادہ خواری ہے تو

فتوائے مے ز ساقی کوثر گرفتہ ایم

میں وہاں اب بھی روز جاتا ہوں، اس سے پہلے بھی جاتا تھا، آیندہ کے متعلق بھی مجھے یقین ہے، آپ کو باور نہ آئے تو یہ آپ کی بزرگی ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ:۔

ما ہمانیم و سیہ مستی ہر روزہ ہماں

قبلہ! گناہ دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جسے "دعوتِ برگ و نوا" کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو "لذتِ جگر خواری" سے آگے نہیں بڑھتے، معلوم نہیں آپ نے مجھے کس معصیت کا مرتکب قرار دیا ہے۔ میری بے سروسامانی و آشفتہ حالی کا جو

عالم ہے وہ آپ سے بھی مخفی نہیں کہ :-

مرا در دہر پنداری وطن نیست

اس لئے ظاہر ہے کہ اس گناہ تک میری دسترس کہاں جو "ارباب توکل" کے لئے "میر ساماں" بن جاتا ہے، رہ گیا صرف دل کا خون کرنا سو بتائیے کہ وہ کون سی بڑی عبادت ہے جو نتیجہ کے لحاظ سے اس کے تحت نہیں آتی، فرق اگر ہے تو صرف "محراب مسجد" و "محراب ابرو" کا اور یہ منحصر ہے ذوق پر۔

معاف فرمائیے اس سے مقصود نہ آپ کے خلوص کو صدمہ پہونچانا ہے اور نہ آپ کو دعوتِ معصیت دینا بلکہ

نوحہ برخویش و بے نوائی خویش

(۲۴)

حقیقت مذہب ــــ آپ بھی کیا داستان لے کر بیٹھ گئے۔ اے حضرت آج کل کا فر و مسلمان دونوں کا ایک حال ہے، نہ اُس کو شیوۂ کافری کا پاس، نہ اس کو آئینِ مسلمانی کا لحاظ، یہ وہ زمانہ ہے کہ :-

چراغِ کعبہ و بُت خانہ بے پروانہ می سوزد

دُنیا بدل گئی، اس کا تمدن بدل گیا، عورت مرد ہو گئی، مرد عورت بن گیا اور آپ کو ہنوز اصرار ہے کہ ریش دراز بھی ہو اور منت کشِ شانہ بھی!

دین و مذہب کے باب میں غالب اپنا فلسفہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :-

سنگ وخشت از مسجد ویرانہ می آرم بشہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یعنی اگر کسی مذہب میں یہ قوت باقی نہیں رہی کہ کوئی تعمیری نظام قایم رکھ سکے تو مناسب یہی ہے کہ اس کی ویرانی پر کسی اور زندہ مذہب کی تعمیر شروع کی جائے۔

اب مذہب نام ہے صرف سیاست کا اور سیاست کی غایت ہے صرف صنعت و تجارت کی ترقی، اس لئے اگر آپکو واقعی مذہبی نزاع سے دلچسپی ہے تو اس طرف آئیے کہ ــــ تاریخ مذہب کے باقیات میں سے اب یہی ایک چیز دُنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے، اب زمانہ "حی علی الصلوٰۃ" کی پکار کا نہیں بلکہ "حی علی العمل" کا ہے :-

راہیکہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما

لیکن آپ کیوں سمجھنے لگے۔

(۲۵)

فلسفۂ حیات ــــ قبلۂ محترم! ۔ نامۂ گرامی جسے "دفتر تدبیر و مصلحت" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، پہونچا مخلصانہ ہمدردیوں کا شکریہ، لیکن کیا کروں فطرتاً کج بیں ہوں اور آپ کی "صراط مستقیم" مجھے نظر ہی نہیں آتی ــ آپ فرماتے ہیں کہ بدنامی و رسوائی بُری چیز ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ :-

عشق منت می نہد آں راکہ رسوا می کند

آپ کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ آنکھ بند کرکے اس آواز کی طرف چلو جدھر ساری دُنیا جارہی ہے؛ یہاں فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ جب تک خود اپنے اندر سے کوئی آواز پیدا نہ ہو قدم نہ اُٹھاؤ، آپ جرس کارواں کے پابند، میں صدائے قلب کا متمنی آپ کو ایمن وطور کی جستجو اور یہاں

پروانۂ چراغ مزار خودیم ما

آپ ہی فرمائیے اتحاد خیال کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ تاہم آپ نے جس خلوص سے میری رہبری فرمائی ہے اسکی ضرور قدر کرتا ہوں اور متمنی ہوں کہ گاہے گاہے اس خانماں خراب کو ضرور یاد فرماتے رہیں۔

(۲۶)

اسلام و ذکرِ موت —— سنئے صاحب! جیتے جی موت کی باتیں مجھے پسند نہیں، مرنا برحق سہی لیکن جب تک آپ جی رہے ہیں اس "واویلا" سے فایدہ بھی کیا ہے، آخرت کے خیال کو آپ "مابعد الموت" سے کیوں متعلق کرتے ہیں۔ آخرت سے مراد انجام ہے اس کا جو ہم آپ اس دُنیا میں کرتے ہیں، ورنہ

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست! —— کے معنی کیا؟

خدا کے لئے اس خیال کو ترک کیجئے، آپ کی صحت پر خراب اثر پڑے گا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مایوس کرکے بے کار بنا دیں گے۔ لاحول ولا قوۃ۔ آپ سے کس نے کہا کہ اسلام کی تعلیم ہر وقت موت کو یاد کرنا ہے۔ مسلمانوں نے تو موت کا مقابلہ کیا ہے، اس سے جنگ کی ہے، اور ایسی جنگ کہ ان میں بہت سے مرنے کے بعد زندہ ہیں اور آپ ہیں کہ زندگی ہی میں مرے جا رہے ہیں!۔

اگر برا نہ مانیے تو عرض کردوں کہ نماز روزہ کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کوئی گناہ بھی کرلیا کیجئے۔ کیونکہ زندگی کا احساس گناہ کے بعد بڑھ جاتا ہے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے اور جب کچھ جان بدن میں آجائے تو بڑے بڑے!

اگر آپ اس کے لئے طیار ہوں تو مطلع کیجئے، تاکہ ہم آپ دونوں ایک ساتھ اس کا تجربہ شروع کریں —— ذرا دیکھئے تو سہی ہوتا کیا ہے؟

(۲۷)

عورت اور پردہ —— بجا ارشاد ہوا، لیکن مجھے آپ کے استدلال سے اختلاف ہے، بے شک پردہ اور اس حد تک پردہ کہ کسی طرح

"اُٹھائے نہ بنے"

کوئی معقول بات نہیں، لیکن بے پردگی کے جو برکات آپ نے شمار کرلئے ہیں، ان سے ضرور مجھے اختلاف ہے، ہوسکتا ہے کہ پایانِ کار بے پردگی "رواج معصومیت" میں معاون ہو، لیکن اس کا تعلق ہمارے آپ کے اخلاق کی بلندی سے نہ ہوگا۔ بلکہ صرف اس بات سے کہ دُنیا کی ہر وہ چیز جو ہماری دسترس سے قریب ہے، دل سے دور ہے۔

صحت کا مسئلہ بے شک قابلِ غور ہے، لیکن اس وقت کی بے پردہ ہندوستانی عورت (مغرب کی عورت کا ذکر نہیں کہ وہ تو واقعی مردِ بن گئی ہے) شاید ہی کوئی ایسی ہو جس کی صحت پر رشک کیا جائے۔ حوّا نے تو گیہوں کے لئے جنت چھوڑی تھی، لیکن حوّا کی یہ بیٹیاں اب نازک بننے کے لئے غذا ہی ترک کر بیٹھی ہیں، وہ نقاہت و نزاکت کو ایک ہی چیز سمجھتی ہیں۔ ہڈیوں کے ڈھانچے پر منڈھی ہوئی کھال، سفید دھوئے کپڑے کا سا رنگ، دھنسے ہوئے گالوں میں ڈگڈگاتی ہوئی آنکھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومیائی شدہ لاش میں مضمحل سی جان پڑ گئی ہے!

چھریرا جسم، کشیدہ قامتی، بے شک رعنائی میں داخل ہے، لیکن ہر ہر پہلو سے نکیلی ہڈیاں چبھو دینے والی عورت تو ایک مستقل خطرہ ہے، رعنائی سے اسے کیا واسطہ!

یہ درست ہے کہ اس کی ظاہری زیبائش و آرائش، جس کو اس نے اسکولوں اور کالجوں میں فن کی حیثیت سے حاصل کیا ہے، اس کے بہت سے نقائص کو چھپا دیتی ہے، لیکن معیاری حُسن تو وہی ہے جو لباس سے جدا ہونے کے بعد اور نمایاں ہو جائے نہ کہ بالکل ختم!

"جنسیات" سے تعلق رکھنے والی باتوں کو چھوڑ کر آپ "تمدنی" حیثیت سے غور کریں تو حالت اور زیادہ افسوسناک نظر آئے گی خانہ داری، تربیت اولاد، اقتصادی نگہداشت وغیرہ جن کی دستگاہ عورت کا حقیقی حُسن ہے، سو آپ کو اس کا شاید زیادہ دردناک تجربہ ہوگا!

مصیبت یہ ہے کہ ہمارے مذہب کی طرح ہماری ساری معاشرت بھی تقلیدی ہے عورت کی بے پردگی کا کیا ذکر!۔ ہماری معاشرت کے دوسرے مسایل کی طرح پردہ کے لئے بھی کوئی اصول موضوعہ مقرر نہیں کیا جا سکتا، زمانہ و ضرورت کے لحاظ سے ہمیشہ اس میں تبدیلی پیدا کرنا ہوگی۔ تعلیم بے شک عورت کے لئے ضروری ہے، لیکن اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ بے پردہ ہو کر سوسائٹی کا تفریحی عنصر بن جائے۔

پردہ تو اس نسل سے میرے یہاں بھی ختم ہو گیا ہے۔ لیکن میں نے اپنی لڑکی کو اسکول نہیں بھیجا، گھر ہی میں پڑھ کر اس نے فارسی میں دبیر ماہر کی سند حاصل کی، پھر ہائی اسکول کا امتحان بھی اسی طرح دیا، اور آیندہ سال ایف، اے میں شریک ہو رہی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں "ترقی پسندی" کی نہیں، لیکن انیسویں صدی کا انسان بیسویں صدی کی مخلوق سے کچھ تو علٰحدہ ہونا ہی چاہئے۔

(۲۸)

خدا و مذہب —— حضرت!۔ آپ کے خط کا جواب دوں بھی تو بے کار ہے۔ کیونکہ جو خدا کو بے دلیل ماننے والا ہو، اسکے سامنے حجت و استدلال پیش کرنا، اب کیا کہوں کیا ہے۔

میں کہوں گا "عقل تو ایسا نہیں کہتی" آپ فرمائیں گے "عقل کیا چیز ہے"۔ میں عرض کروں گا کہ "اسباب کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں"۔ آپ کہیں گے کہ "مشیتِ ایزدی" میں کس کو مجالِ دم زدن ہے۔

پھر آپ ہی فرمایئے کہ اس "قدرت و مشیت" کا علاج میرے پاس کیا ہو سکتا ہے۔ آپ نمرود کو اس لئے برا کہتے ہیں کہ اس نے "خلیل اللہ" کو آگ میں ڈال کر جلانا چاہا، میں کہتا ہوں کہ طرحِ گلستاں "آتشِ نمرود" ہی نے ڈالی۔

من آتش از دخاں بینم تو از آتش دخاں بینی

آپ کا خدا اور مذہب دونوں بہت نازک ہیں، اس لئے مجھے خاموش ہی رہنے دیجئے تو بہتر ہے۔

(۲۹)

خدا کا تصور ــــــ جی ہاں با۔ معاملہ کچھ سرد تو ہو گیا ہے، لیکن؟

گیرد صبا خراج ز خاکسترم ہنوز

اب بھی "خانوادہائے علم و فضل" سے جو جھونکا ادھر آتا ہے وہ گرم ہی ہوتا ہے، خدا کے لئے آپ ہی ان کو سمجھایئے کہ خدا سے محبت کرنا یہ کب سکھائیں گے ــــ صدیاں گزر گئیں کہ خدا کو انھوں نے ہیبت و جلال والا بادشاہ بنا کر پیش کیا۔ اب اسے عرش سے نیچے اُتار کر ذرا فرش پر بھی تو لائیں۔ خاک نشینوں کو بھی تو دیکھنے کا موقع دیں آخر وہ وقت کب آئے گا، جب خدا انسان سے گھل مل کر اپنی جگہ ان کے دل میں پیدا کرے گا۔

خدا کے جس تصور نے اس وقت ساری دُنیا کو خاک و خون میں تڑپا رکھا ہے۔ کیا وہ اب بھی ختم نہ ہوگا۔ کیا انھوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک انسانی آبادی ختم نہ ہو جائے گی وہ خدا کو اس مصیبت زدہ کرۂ زمین پر آنے کی اجازت نہ دیں گے۔ کیا خدا کی حکومت اب صرف درندوں اور عفریتوں پر ہوگی! یہ آخر قصہ کیا ہے!

(۳۰)

فردوس و جہنم ــــــ یہ آپ نے خوب سوال کیا کہ "دُنیا میں کسی چیز کا میں قایل بھی ہوں، یا نہیں"

اے حضرت، آپ کا قایل ہوں، آپ کی پارسائی کا قایل ہوں، اور آپ کی اُن شب زندہ داریوں کا قایل ہوں، جو صبح سے شام تک آپ کے چہرے کی شکنوں کو دور نہیں ہونے دیتیں اور ان سب سے زیادہ آپ کے اس قول کا قایل ہوں کہ:-

"جو ہم میں سے نہیں وہ کہیں کا نہیں!"

کائنات کے معمہ کو ایجاز کے ساتھ صرف ایک فقرہ میں حل کر دینا، ایسا کھلا ہوا اعجاز ہے، کہ میں کیا، دُنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی آپ کے سامنے سرِ نیایش جھکا دینے پر مجبور ہوگا۔ سچ ہے ــــ ایں سعادت بزورِ بازو نیست!

اس سے زیادہ خراجِ تحسین آپ چاہتے ہوں تو دریا آباد یا اعظم گڑھ جایئے، ہو سکتا ہے کہ اس سومناتھ میں بت کی حیثیت سے آپ کو بھی کوئی نمایاں جگہ مل جائے۔ مجھ پر آپ کیوں بار بار اپنا وقت ضایع کرتے ہیں!

مسلماں کافرم، کافر مسلماں
نہ دینم رونقے دارد نہ دُنیا

اگر اسلام کا مفہوم واقعی وہی ہے جو آپ لوگوں نے قرار دے رکھا ہے تو ــــ "ہزار خندۂ کفر ست بر مسلمانی"

اگر جنت احمق بننے کے بعد ہی مل سکتی ہے تو آپ کو مبارک ہو، مجھے جہنم دیجئے کہ وہاں لاکھ تکلیف سہی لیکن کم از کم صحبتِ ناجنس کا عذاب تو نہ ہوگا، یہ اطمینان تو ہوگا کہ آپ وہاں نہیں ہیں! یہ راحت کیا کم ہے!

(۳۱)

مذہب ربانی ــــــ چھوڑیئے اس قصہ کو، آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں ــــــ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔

آپ کی محبت کا ہمیشہ سے زیر بار ہوں، کیوں آپ بار بار مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ میں اپنی ہستی سے زیادہ واقف ہوں اور انتہائی عالم کیف و سرشاری میں بھی اپنی جگہ "پائیں" کے علاوہ کہیں نہیں پاتا۔ جو حضرات اپنے آپ کو مسند نشین سمجھتے ہوں اُن کو دعوائے صدارت مبارک، لیکن میں بھی اس کی تصدیق کروں، یہ محال ہے، کیونکہ میں تو انھیں پائیں سے بھی کچھ نیچے، اپنے سے بھی کچھ فرو تر پاتا ہوں!

آپ کو نہیں معلوم کہ ان "خانوادگانِ علم و مذہب" میں کس کبر و ریا کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور کیسا کیسا "زبردست فرعون" وہاں سانس لے رہا ہے۔ انھوں نے انسانی آبادی کو گھٹا کر صرف اپنی چار دیواری میں محدود سمجھ رکھا ہے اور خدا کو اس سے بھی زیادہ مختصر کر کے اپنے جیب و آستین میں لئے پھرتے ہیں!

ان کے یہاں "خلیفۃ اللہ فی الارض" وہ نہیں ہے جو نوامیسِ قدرت کی جستجو کر کے خدا کو پہچانتا ہے۔ بلکہ وہ خدا آپ کو سمجھتا ہے، صرف اس لئے کہ اس نے مرغ و ماہی کو پیدا کیا، اور انسان کو ان کے کھانے کی توفیق عطا فرمائی۔ اپنے جنت بنائی اور جنت کی خوبصورت حوروں پر انھیں تصرف کی اجازت دی!

آپ کہیں گے مذہب تنہا اسی کا نام تو نہیں، میں کہوں گا مذہب میں اس کا ذکر ہی کیوں ہے۔ آپ فرمائیں گے اس میں حرج بھی کیا ہے! میں عرض کروں گا کہ پھر دنیا میں کیوں اس کی آزادی نہیں۔ وہی انسان، وہی اس کے جذبات لیکن یہاں مجبور، وہاں مختار، کیوں؟ —— شاید اس لئے کہ یہاں سوشل نظام کے لئے جبر و اکراہ کی ضرورت ہے۔ تو کیا وہاں کا نظام سوا اس "آویزش" کے اور کچھ نہ ہوگا —— معاذاللہ! انسان کو چھوڑئیے، کیا خدا کی توہین اس سے زیادہ کچھ اور ہو سکتی ہے؟ لیکن کیا کیجئے:

بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت

(۳۴)

مذہبی اختلاف —— قبلہ! — بتعمیل ارشاد آپ کی کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں، لیکن آپ کو یہ سن کر شاید افسوس ہوگا کہ میرے خیال میں مطلقاً کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی — ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات اُن کے مطالعہ کے بعد آپ کے ہم خیال ہو گئے ہوں، مگر یہاں تو وہی کیفیت ہے:

آتشے تیز ست و داماں می زنم!

حیرت ہے کہ آپ نے اب تک یہی نہیں سمجھا، میرا زاویۂ نگاہ کیا ہے؟ سوال "وجود باری" کا نہیں، بلکہ اس مخصوص تصور کا ہے جو اس کی آمرانہ شخصیت کے متعلق پیش کیا جاتا ہے۔ کسی ایسی قوت کا وجود تسلیم کرنا جو کائنات کے ظہور و نشو و نما کا باعث ہوئی، ضروری ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہو، لیکن اس قوت کو تمام اُن صفات سے متصف کرنا جو انسان کی جذباتی دنیا سے متعلق ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا!

انسان نے اپنے ابتدائی دور میں بھی، جب وہ حیوانیت سے قریب تر تھا، اس قوت کو تسلیم کیا، جب اس کے ذہن نے ترقی کر کے اصلاح معاشرت کے کچھ قوانین مرتب کئے، اس وقت بھی وہ اس قوت کا معترف تھا اور اب بھی جبکہ انسان نے دنیا کے بہت سے عناصر پر قابو پا لیا ہے، وہ اس قوت کا منکر نہیں ہے، مگر فرق یہ ہے کہ ابتدائی دور میں انسان نے

نے اسے اپنے سے زیادہ قوی الجثہ سمجھ کر اس کے دیو پیکر بُت طیار کئے، دوسرے دور میں انسان نے اسے حد درجہ سریع الاحساس سمجھ کر اسے اپنا ہی جیسا ایک جذباتی انسان سمجھا اور اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُس قوت اور دُنیا کے کاروبار میں صرف وہ تعلق ہے جو بجلی اور بجلی سے چلنے والی مشینوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

ان تینوں ادوار میں فی الحال درمیانی اور موجودہ دور زیر بحث ہیں اور وہ اس طرح کہ درمیانی دور میری سمجھ میں نہیں آتا اور آخری آپ کی سمجھ سے باہر ہے، یہ تو ہوئی اصل نزاع، لیکن آپ نے کبھی یہ بھی غور کیا کہ یہ اُلجھن کیوں دور نہیں ہوتی؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اپنی اور اپنے حریف کی پوزیشن کو سمجھ لیجئے۔

دوسرا فریق چونکہ کاروبارِ حیات اور اس کے نتائج کو صرف اپنے عمل سے متعلق سمجھتا ہے اور خدا کو بیچ میں نہیں ڈالتا۔ اس لئے اُسے پروا نہیں، خواہ آپ خدا کو بُت سمجھیں یا انسان لیکن آپ چونکہ دُنیا و آخرت دونوں کی فلاح خدا ہی سے متعلق سمجھتے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص اس کے خلاف کہتا ہے تو آپ کو حیرت بھی ہوتی ہے اور غصہ بھی آتا ہے (خیر حیرت پر تو تعجب نہیں، لیکن غصہ کیوں آتا ہے، یہ بات سمجھنا مشکل ہے) بہرحال آپ کے طرزِ عمل سے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ خدا کے تصور سے جتنا آپ کو تعلق ہے، آپ کے حریف کو نہیں اور اس لئے آپ ہی کا یہ فرض ہے کہ آپ اپنے دعوے کو ثابت کریں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ بجائے اپنا دعوےٰ ثابت کرنے کے آپ اپنے حریف کے عقاید کو باطل ثابت کرنا چاہتے ہیں! حالانکہ اس میں اگر آپ کو کامیابی ہو بھی جائے تو اس سے آپ کے عقیدہ کی صحت کیونکر ثابت ہو سکتی ہے، جبکہ نزاع "ہاں اور نہیں کی نہیں" بلکہ صرف تعبیر و تصور کی ہے!

یقیناً ہر وہ شخص جس نے نظامِ کائنات پر ذرا سا بھی غور کیا ہے، وہ کسی ایسی قوت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے جو وجودِ کائنات کا باعث ہوئی، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ کسی وقت دورِ جاہلیت میں منکرِ خدا پیدا ہو تو ہوا ہو، لیکن اب وہ آپ کو کہیں نہیں مل سکتا — علم و عقل کی ترقی نے کچھ اور کیا ہو، یا نہ کیا ہو، لیکن الحاد و انکار کو اس نے ضرور دُنیا سے محو کر دیا۔

یہ بات سُن کر آپ کو شاید حیرت ہو گی، لیکن اگر آپ غور کریں گے تو ماننا پڑے گا کہ جس بات کو آپ "کفر و انکار" کہتے ہیں، وہ خدا کے وجود کا انکار نہیں، بلکہ آپ کی "تعبیرات" کا انکار ہے، اور خدا کی ذات غالباً میری آپ کی تعبیرات سے بہت بلند واقع ہوئی ہے۔

آپ تو بہت وسیع مطالعہ کے انسان ہیں، آپ نے یقیناً مفکرینِ اسلام کی کتابیں دیکھی ہوں گی، پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس خاص مسئلہ میں ان کی تصانیف کا ماحصل اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ "ما عرفناک حق معرفتک" اور کیا آج کل کے اہلِ علم کچھ اور کہتے ہیں۔

فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ آپ پر ایک مابعد الطبیعیاتی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ان پر "طبیعیاتی"، یعنی آپ اس دُنیا سے مایوس ہو کر دوسری دنیا کا خواب دیکھنے لگتے ہیں، اور وہ اسی دُنیا کو سب کچھ سمجھ کر بے تابانہ مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں۔

انھیں باتوں کو دیکھ کر بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ اگر نبوت کا اختتام آدم پر مان لیا جاتا، اور اس کے بعد دوسرے پیغمبر نہ آتے تو شاید نوعِ انسانی میں یہ تفریق پیدا نہ ہوتی اور بجائے عیسوی، موسوی اور محمدی ہونے کے آج سب آدمی ہوتے!

حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان اپنے ”مابعد الطبیعیات“ کو ترک نہ کرے گا، یہ منافرت، دور نہ ہوگی، اور مذہب نام ہے صرف ”مابعد الطبیعیات“ کا، اہلِ مذاہب کہتے ہیں کہ ترک مذہب کے بعد بھی دُنیا میں امن و سکون قایم نہیں ہو سکتا، اور اس کے ثبوت میں وہ یورپ کی پچھلی اور موجودہ جنگ کو پیش کرتے ہیں۔ یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر دنیا میں مذہبی تفریق نہ ہوگی تو قومی تفریق ہوگی۔ خونریزی اگر مذہب کی وجہ سے نہ ہوگی، تو قومی اغراض کی وجہ سے ہوگی — بظاہر یہ اعتراض درست معلوم ہوتا ہے، لیکن انھوں نے شاید غور نہیں کیا، کہ موجودہ قومی منافرت کی بنیاد بھی مذہب ہی ہے۔ یورپ کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عیسوی مذہب کے عقیدتمندوں نے دنیا کی آبادی پر کچھ کم ظلم نہیں کئے اور خود پروٹسٹنٹ اور کیتھولک جماعتوں میں بھی باہمد گر معمولی کشت و خون نہیں ہوا۔

پھر یہی قدیم مذہبی عناد تھا۔ جس نے بعد کو ”قومی تفریق“ کی صورت اختیار کرلی اور یہ ”اختلاف عقاید“ ہی کا جھگڑا تھا جس نے اول اول فساد کا بیج بویا۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا میں قیام امن و سکون کا مسئلہ اب بڑا مشکل مسئلہ ہوگیا ہے اور اس پر غور کرنا ہر شخص کا فرض ہے، لیکن اس گتھی کو سلجھانے کی صورت شاید یہ نہیں ہے کہ ساری دُنیا شیعی، حنفی، وہابی یا صوفی ہو جائے — نیاز مذہبی کیوں نہ ہو جائے۔

(۴۴)

وحی و الہام —— حضرت! - وحی و الہام کے جھگڑے میں آپ اب بھی مبتلا ہیں؟ - حالانکہ کشف، وحی، الہام، سب ایک ہی چیزیں ہیں اور ان میں سوا اس کے کوئی فرق نہیں کہ مختلف لوگ اس کیفیت کو مختلف الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ یعنی وحی انبیاء کے لئے مخصوص ہے اور کشف غیر انبیاء کے لئے، الہام میں انبیاء اور اولیاء دونوں مشترک ہیں۔ غالب کا ایک شعر یاد آگیا:-

شعرِ غالب نبود وحی و نگوئیم ولے!
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست!

(یعنی غالب کا شعر وحی تو نہیں ہے اور نہ ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں، لیکن خدا کے لئے یہ تو نہ کہو کہ وہ الہام نہیں ہے)

غالب نے وحی و الہام کے اسی فرق کو پیش نظر رکھ کر یہ شعر کہا ہے۔

آج کل انگریزی کا ایک لفظ بہت استعمال ہو رہا ہے، جس سے آپ بھی واقف ہوں گے۔ وہ لفظ ”Initiative“ ہے وحی کو Revelation کہتے ہیں۔ آپ ان دونوں کا فرق سمجھے؟ ان میں بالکل ارادہ و عمل کا سا تعلق ہے اس لئے ہر چند وحی یا الہام، مقدم چیز ہے، لیکن کام کی بات وہی (Initiative) یا اقدام ہے جس سے انبیاء کو کامیابی حاصل ہوئی۔

اس لئے میری رائے میں ”وحی و الہام“ پر غور و فکر بے کار ہے، آپ کو تو جو کچھ کرنا ہے کر ڈالئے خواہ نتیجہ کچھ ہو۔ غارِ حرا کا زمانہ ختم ہوگیا ہے، لیکن بدر و حنین کا ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس لئے ”سر بگریباں“ نہ رہئے، بلکہ آستینیں چڑھائیے۔

عشق اگر مرد ست، مردے تابِ دیدار آورد
ورنہ چوں موسیٰ بسے آوردہ بسیار آورد!

(۳۴)

فلسفۂ عبادت ـــــ معقول ! ۔ ۔ آپ سے کس نے کہا کہ میں نے نماز کبھی نہیں پڑھی اور روزے ہمیشہ قضا کئے ! میں نے ۔ دونوں حرکتیں کی ہیں اور اس جوش و ولولہ کے ساتھ کہ آخر کار اُن سے بے نیاز ہوگیا ۔ لیکن یہ بے نیازی اُس زاہدِ شب زندہ دار کی سی نہیں، جو اپنی عبادت سے خدا کو خرید لینے کا یقین رکھتا ہے، بلکہ اس مستسقی کی سی جس کی پیاس دریا کے کنارے بھی نہیں بجھتی !

جب تک خدا کو میں نے مذہب کے بتائے ہوئے اُصول سے سمجھنے کی کوشش کی تو سارا وقت اس دھڑکے میں بسر ہوا ۔

تا بہ بینیم سرِ انجام چہ خواہد بودن

لیکن جب خود اپنی فراست سے اس کو سمجھا، تو آپ جانتے ہیں کیا ہوا ؟

خاکِ او گشتم و چندیں درجاتم دادند !

آپ سمجھے یہ "درجات" کیا، وہی "درجات بے نیازی" ! وہی

نتواں تر او جاں را بہم امتیاز کردن !

پھر اگر کوئی مجھے بُرا کہتا ہے تو مجھے دُکھ نہیں پہونچتا، بلکہ راحت پہونچاتا ہے ۔

اجد الملامۃ فی ہواک لذیذۃ حبا لذکرک فلیلمنی اللوم !

(۳۵)

مذہب اور مولوی ـــــ یہ بالکل درست ہے کہ زمانہ سازی بُری بات نہیں، لیکن اگر اس کے بعد بھی کار برآری نہ ہو تو پھر کیا فتویٰ ہے ؟ وہی خودکشی، جسے آپ حرام کہتے ہیں ـــــ جس چیز کا نام ضمیر ہے، اس میں شک نہیں بڑی نامعقول شے ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ خود انسان کا وجود ـ جو مجموعۂ نقائص کے سوا کچھ نہیں ـ قدرت کی کونسی معقولیت ہے ! میں سمجھتا ہوں کہ کائنات ابھی تخلیق و تجربہ سے بھی آگے نہیں بڑھی، تکمیل و تجمیل، کیسی ! اس لئے بدتمیزی کا دور تو ابھی رہنا ہے، اور معلوم نہیں کب تک، آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں ـــ جب موت، زندگی پر اختیار نہیں، تو پھر خوش حالی و بدحالی کی کیا فکر ؟

خدا جانے دُنیا میں کتنی قومیں آئیں، اور فنا ہوگئیں، مسلمانوں ہی میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہے، پھر افسوس تو مجھے بھی ہوتا ہے، لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں ۔ آپ مذہبی اصول کو لئے پھرتے ہیں، حالانکہ اب وہ فکرِ فضول سے زیادہ نہیں ۔ دُنیا میں ہمیشہ مذاہب کو واعظین ہی نے تباہ کیا ہے، اور اب بھی یہی ہوگا ! ۔ اگر آپ اس جماعت کو فنا کر سکتے ہیں تو اپنے بقا کی امید کیجئے ! ورنہ خاموشی سے آنکھ بند کر کے چلے جائیے، جہاں مولوی لے جائے، خواہ وہ جہنم ہی کیوں نہ ہو !

(۳۶)

مطالعۂ مذہب ـــــ زمانہ بہ سر جنگ ست یا علیؑ مددے ! ۔ سے کام نہیں چلتا ۔ خود علیؑ کے زمانہ میں

یا علی بکنے والوں کی مدد کس نے کی تھی کہ اب آپ اس کی توقع کریں!

آپ کے مسلک والوں میں مجھے غالب پسند تھا کہ اُس نے "علی اللہی" ہونے کا صرف وہ رنگین پہلو اختیار کیا، جسے وہ اپنی زبان میں :-

بر لب، یا علی سرائے، بادہ روانہ کردہ ایم

کہتا ہے —— اے کسی انسان کو خدا ماننے کے بعد اگر اتنا فایدہ بھی نہ ہو، تو اپنی بندگی، اور اس کی بندہ نوازی دونوں پر لعنت!

آپ جانتے ہیں، میں مذہب کا مطالعہ صرف تاریخی و علمی حیثیت سے کرتا ہوں، اور آپ کا مسلک صرف جذباتی و تفریحی ہے، اس لئے آپ سنجیدگی کو دخل دے کر کیوں میرا لطف ضایع کرتے ہیں، اور اپنا وقت!

(۴۷)

مذہب کا صحیح تصور —— حضرت! - آپ کی بندہ نوازی میں کلام نہیں، لیکن مجھے فکر یہ ہے کہ اگر کسی وقت آپ نے یہ جان لیا کہ میں واقعی آپ کے "بندگانِ فرمانبردار" میں سے نہیں ہوں، تو آپ کو کتنا افسوس ہوگا!

میں نے کبھی آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، اور آپ نے ہمیشہ مجھ پر لطف فرمایا، شاید اس لئے کہ میرا اختلاف آپ کے نزدیک محض تفنن ہے، اور میں دل سے وہی ہوں جو آپ سمجھتے ہیں - لیکن آج میں نہایت صفائی کے ساتھ آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یوں تو میں آپ کا نہایت ادنیٰ خادم ہوں، لیکن اگر آپ کی خداوندی کا مطالبہ یہ ہے کہ اپنا دل و دماغ بھی آپ کو سونپ دوں، تو یہ میرے امکان میں نہیں —— یہ سب کچھ میری "سیہ بختی" سہی، لیکن ہے تیری اپنی، اور اس لئے مجھے اُس "نورِ باطن" سے زیادہ عزیز ہے، جو کسی اور سے مستعار ہو۔

آپ خدا کا ذکر میرے سامنے اس طرح کرتے ہیں، گویا میں نے کبھی یہ نام سنا ہی نہیں، حالانکہ سننے سے زیادہ میں نے اُس کو سمجھا ہے اور اس لئے میرا خدا بھی سب سے الگ ہے، اور میرا آئینِ بندگی بھی سب سے جُدا :-

عکس افتادہ در آئینۂ ہوشش!

گل تواں گفت و لے چیدن نیست!!

میں اس باب میں جس منزل سے گزر رہا ہوں، وہ وہی ہے جو درویشوں میں صابر کلیری کی تھی، اور شعراء میں بیدل کی - یعنی صرف "اظہارِ عجز و سکوتِ حیرت!" جبکہ نیایش و بندگی، اور اطاعت و عبادت سب کا سوال اٹھ جاتا ہے :-

زاہدی نمی دانم تقوئے نمی خواہم

سینۂ صافی دارم نذرِ دردنوشیہا

آپ لوگ خدا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا اس کے حضور میں آپ کو روز شرفِ باریابی حاصل ہوتا رہتا ہے، اور اس کے کاروبار کا علم آپ کو پوری طرح حاصل ہے، اور میرے یہاں خدا کا نام ہے صرف اپنے احساسِ نارسائی کا، محض اس علم و یقین کا کہ ہم کو اس کی حقیقت کا علم ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا مذاہبِ عالم کا نظریہ سو اس باب میں میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے جو تصورِ خدا کا پیش کیا ہے، وہ تصور خدا کا نہیں، بلکہ اظہار ہے اُن ذہنیتوں کا جو اختلافِ قومیت و مرز بوم کے لحاظ سے

دُنیا میں علٰحدہ علٰحدہ پائی جاتی ہیں!

آپ مجھے اسلام سے بیگانہ بتاتے ہیں، شاید ایسا ہی ہوگا، لیکن اگر اسلام نام ہے تمام ادیات سے گزر جانے کا تو پھر مجھے بھی ان محراب و منبر کے جھگڑوں سے گزر جانے پر ملامت نہ کیجئے، اور اگر یہ قید ضروری ہے تو پھر کبھی نہ کبھی مندر میں بھی سربسجود ہو جانے کی اجازت دیجئے، کیونکہ اگر خدا کہیں نہیں ہے، تو اس کی پرستش خواہ مندر میں ہو یا مسجد میں بیکار سی بات ہے، سر پھوڑنے کے لئے پتھر کی قید کیسی ـــــ بت ہو یا محراب دونوں ایک ہیں:-

مقامِ وصل نایاب ست و راہِ سعی ناپیدا
چہ می کردیم یارب گر نبودے نارسیدنہا

(۳۸)

گناہ و معصیت ـــــ اپنے خط کے جواب میں، سعدی کا ایک شعر سُن لیجئے!

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست، آما پیشِ خلق
بعض می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

اگر گناہ و معصیت کا تعلق خدا سے ہوتا تو بھی غنیمت تھا، لیکن قہر تو یہی ہے کہ وہ زہد و رندی دونوں سے بے نیاز ہے اور مکر و ریا سے کام ہے کہ اگر ہم اسے چھپانا بھی چاہیں تو پاداش سے نجات ممکن نہیں!

ہو سکتا ہے کہ میرا دفترِ معصیت زیادہ سیاہ ہو، لیکن میں اسے غلط کہکر اس کی سیاہی میں زیادہ اضافہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی کہتا ہوں اور برملا کہتا ہوں، اور بقول شخصے ”بہ بانگِ کوس می خورم“۔ لیکن جو کہنا وہ نہ کرنا، جو کرنا اسے نہ کہنا، اسے آپ کیا کہیں گے۔ غالباً فہم و فراست۔ درست ہے، لیکن میں پھر وہی سعدی کا شعر پڑھوں گا کہ:-

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست، آما پیشِ خلق
بعض می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

(۳۹)

مرتبۂ رندی ـــــ لاحول ولا قوۃ! تم بھی عجیب چیز ہو۔ اگر خلوت تک رسائی نہیں تو نہ سہی:-

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم ست

چونکہ تم مردِ تقدیر ہو، مردِ تدبیر نہیں، اس لئے تم صرف مدعا کو جانتے ہو، حصولِ مدعا کی راہوں کو نہیں!

یہ صحیح ہے کہ تم مومن ہو، اور دُنیا کا حُسن و جمال تو وہاں مومن ہی کے لئے وقف ہوگا! لیکن یہ تو غور کرو کہ دُنیا میں تنہا تم ہی ایک ہی مومن نہیں، مومن کانفرنس ہی کے لاکھوں افراد تمھارے رقیب نکل آئیں گے، اس لئے یہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز تم کو پسند ہے وہ کسی اور کو پسند نہ آئے اور اگر اس تقسیم میں مرضی کو بھی دخل ہوا، تو چھٹے چھٹی ہوئی ـــ داڑھی تم منڈاؤ گے نہیں، اور داڑھی والوں میں تمھاری ”زنخ پوشش“ داڑھی کو کون پوچھے گا۔

بے وقوف ہوئے ہو، گھر میں چین سے بیٹھو، نماز کے پابند پہلے ہی سے ہو۔ رمضان آ رہا ہے، اور اد و وظائف اور بڑھا دو، رندی بڑی مشکل چیز ہے، یہاں تو شراب کی جگہ شراب ہی چاہئے۔ یہ نہیں کہ پانی نہ ملا تو تیمم کر لیا۔

اگر تمھاری رسائی وہاں "نظارۂ بعید" کی حد تک بھی ہے تو غنیمت جانو "خلوتیانِ راز" میں شامل ہونے کی اہلیت نہ تم میں کبھی تھی نہ ہوگی، رہی تمھاری مایوسی سو اس کی ایک تاویل بیدل نے بڑی معقول کی ہے:۔

گل بہ سر داریم تا دستے بہ سر داریم ما!

اپنا سر کسی اور کا نہیں! یعنی اگر دیوار سے سر ٹکرانے کا حوصلہ نہیں، تو سر پکڑ کر گھر ہی میں بیٹھا رہنا بھی کم فخر کی بات نہیں!

(۴۰)

فلسفۂ معصیت —— صدیق مکرم۔ آپ کا معذرت نامہ پہونچا۔ جس میں زیادہ کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ آپ کے اس "عذرِ گناہ" کو "بدتر از گناہ" نہ سمجھا جائے۔

میرے عزیز دوست، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ "عذرِ گناہ" کو گناہ سمجھنے کی غلطی مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی مگر اس وقت کہ اس سے مقصود واقعی "اجتناب و احتراز" ہی ہو۔ پھر آپ نے یہ کیسے جانا کہ میں آپ کو خدا نخواستہ "نصوح" سمجھ کر آپ کی اس معذرت پر ایمان بھی لے آؤں گا —— آپ بھی عجیب چیز ہیں، کیسی معصیت اور کہاں کی توبہ، گناہ کیجئے اس نیت سے کہ معذرت کی فرصت ہر وقت نصیب ہے اور معذرت کیجئے اس عزم کے ساتھ کہ آئندہ پھر وہی گناہ کرنا ہے خصوصیت کے ساتھ میرے معاملات میں جو آپ کو بے گناہ سمجھنے کے گناہ میں ایکبار بھی کبھی مبتلا نہیں ہوا، ہوش کھو آئیے اور جو جی چاہے کیجئے۔

تو ہر گناہ کہ خواہی بکن کہ معذوری

(۴۱)

مدارج ترقی کا راز —— محب گرامی۔ ایک زمانہ کے بعد آپ نے یاد فرمایا۔ میں نے تو اس خیال سے مراسلت میں تقدیم نہیں کی کہ آپ مجھ سے خفا ہیں۔ اور آپ نے اس لئے پروا نہیں کی کہ میں کبھی آپ سے خفا ہو ہی نہیں سکتا، اور جو کبھی خفا ہونا نہ جانے اسکو پوچھنا ہی کیا، اللہ، اللہ، کیا فرقِ مراتب ہے! — جی ہاں، زندہ ہوں لیکن شکر ادا کرنے کی حد تک نہیں۔ آپ پر رشک کرنا تو کوئی جرم نہیں بشرطیکہ آپ کو اس کا یقین بھی آجائے کہ رشک واقعی کوئی تکلیف دہ چیز ہے۔

یہ تو آپ کی گزشتہ زندگی پر طعن ہے اور نہ میری موجودہ زندگی کی صحیح تصویر، بلکہ مقطع کی بات تھی اس لئے مجبوراً سخن گسترانہ انداز میں بیان کی گئی، آپ کچھ اور خیال نہ کیجئے گا —— یقیناً میرے خیال میں تغیر پیدا ہو گیا ہے اور بہت کافی۔ آپ ملامت انگیز انداز سے پوچھتے ہیں، یہ کیا ہے —— جواب میں سوا اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ:۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

خوش رہئے، کیونکہ ایک زمانہ وہ آنے والا ہے، جب یہ مجھے برا کہنے والے تھک کر بیٹھ رہیں گے اور میرے لئے جینا اجیرن ہو جائے گا، آپ کو معلوم نہیں "ملامتیا طبقہ" کا درویش ہوں اور میرے مدارج کی ترقی کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ لوگ مجھے گالیاں دیں اور میں سن کر ہنسوں۔

متفرقات

(۱)

عذرِ سفر —— کیوں صاحب، یہ تحایف کی تقسیم خویش سے گزر کر درویش تک پہونچی ہی نہیں، یا

چوں دورِ خسرو آمدے در سبو نماندہ

خوش رہئے، آپ کے یاد نہ کرنے میں بھی لطف ہے۔

ہاں، جھانسی سے وہ تبدیل ہو گئے، اور ایسی جگہ پہونچے ہیں کہ خضر شاید چشمۂ حیوان تک تو پہونچ جاتے، لیکن یہاں تک وہ کبھی نہ پہونچ سکتے۔ دس میل فی گھنٹہ چلنے والی ریل سے ۴۸ گھنٹہ کا سفر کر کے ایک ایسے اسٹیشن پر اُترے، جہاں آپ کو صرف ایک متنفس نظر آئے گا۔ جو غریب قلی بھی ہے اور بابو بھی! اس کے بعد کہیں بیل گاڑی سے اور کہیں پیادہ پا ۸۰ میل کی وہ منزل طے کیجئے جس میں آپ کو کم از کم پانچ پہاڑ، دس دریا اور بیس صحرا عبور کرنا ہیں۔ پھر کہیں جا کر آپ یا آپ کی لاش اُن حضرت کے آستانہ تک پہونچ سکے گی۔

آپ جاتے ہوں تو جائیے، لیکن مجھے بخشئیے۔ اتنی تکلیف اُٹھا سکتا تو آج حاجی ہوتا۔

(۲)

ایاز قدرِ خود بشناس —— صدیقی!۔ خط ملا، پڑھ کر ہنسی آگئی۔ حیرت ہے کہ تیس سال کی ملاقات کے بعد آپ میرا کمزور پہلو نہ جان سکے!۔ آپ نے وہ خدمت میرے سپرد فرمائی ہے کہ بنا بنایا کام بھی بگڑ جائے۔ عورت کے باب میں میرا نظریہ یہ ہے کہ وہ انتہائی گناہگار ہونے کے باوجود بھی رابعہ بصری سے زیادہ معصوم ہے!۔ یقیناً آسیہ بیگم نے زیادتی کی ہوگی۔ لیکن،

نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

ان حضرت کو کیا سوجھی کہ خواہ مخواہ اپنے کو "قوامون علی النساء" ثابت کرنے کے لئے اُلجھ پڑے!

اے حضرت، وہ کسی فقیر کی لڑکی تو ہے نہیں کہ باپ نے سر کا بوجھ اُتارنے کے لئے اس کی شادی کر دی ہو، نسل میں وہ آپ کے دوست سے بہتر، عزت و اقتدار میں وہ آپ کے دوست پر فایق، جاہ و ثروت میں وہ آپ کے دوست سے بڑھی چڑھی، اور خیر صورت کا تو ذکر ہی فضول ہے، کیونکہ اگر وہ آفتاب ہے تو یہ آفتابہ بردار، پھر آپ ہی بتائیے کہ اس حالت میں سوا ایک فدوی، قسم کا شوہر بنے رہنے کے چارہ ہی کیا ہے، لیکن آپ کے دوست کی حماقت ملاحظہ کیجئے کہ بیگم سے وہ توقع رکھتے ہیں، چاکری کی، کنیز بن کر رہنے کی!۔ معقول!

ان سے کہہ دیجئے —— "ایاز قدرِ خود بشناس"

(۳)

مشورۂ مصالحت —— میں تو آپ کو صرف "خداوند" کہتا تھا۔ "خدا" کب سے ہو گئے ؟۔ لیکن اگر آپ یہ پوچھ بیٹھے کہ ان دونوں میں فرق ہی کیا ہے، تو سوا چپ رہنے کے اور کیا کر سکتا ہوں !

بندہ نواز، خدا جانے کتنے ناتمام شکوے ایسے ہیں جو ایک زمانہ سے سینے میں چبھ رہے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی آپ پر ظاہر نہیں ہونے دئے، اب آپ چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ "داشگاف" ہو جائے۔ شاید اس لئے کہ آپ کے نزدیک ہم بندگانِ ضعیف میں صدائے "لن ترانی" سننے کی تاب نہیں ہے یا پھر اس لئے کہ :۔

تا کجا خواہم فشردن ایں دامنِ نم ناک را !

بہرحال آپ خدا ٹھہرے، اور خدا کی نیت کا حال خدا ہی کو معلوم ہو سکتا ہے، اس لئے میں زیادہ قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے ڈرتا ہوں، مگر اتنا ضرور عرض کردوں گا کہ یہ دور "عدمیت" کا ہے۔ یعنی بادشاہ اور بادشاہ کے قسم کی جتنی چیزیں ہیں سب دُنیا سے محو ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لئے اگر حرج نہ ہو تو "کارگاہ کبریائی" کو زیادہ وسیع نہ ہونے دیجئے۔ اور ہو سکے تو اسے مختصر کر کے انسانی دسترس سے قریب تر کر دیجئے، ورنہ دُنیا میں جنید و شبلی کے پاس بھی اس کا جواب نہیں کہ :۔

رہ گم شدگانیم، چہ جوئیم خدا را !

پھر میں یہ تو نہیں کہتا کہ جن کو آپ نے خفا کر دیا ہے، انھیں خود ہی بلائیے، لیکن اگر وہ آنا چاہتے ہیں تو کم از کم انھیں ٹھکرائیے بھی نہیں !۔ "یوسفِ بے کارواں" بھی کوئی "یوسف" میں "یوسف" ہے !۔

(۴)

فکر بیجا —— حضرت !۔ آپ مستقبل کی تاریکی سے گھبرا رہے ہیں اور میں اس کی روشنی ابھی سے محسوس کر رہا ہوں آپ کا یہ اعتراض یا استفسار بالکل درست ہے کہ :۔

نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں اسکے توسن کو ؟

لیکن کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں !

پائے بوسِ سیل از پا افگند دیوار را

قبلہ، فطرت جتنی فیاض ہے اتنی ہی کھلنڈری بھی ہے، جو خدا عاد و ثمود کو تباہ کر سکتا ہے، جو بابل و نینوا کی سربفلک عمارتوں کو کھنڈر بنا سکتا ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے ! محفل کا دستور ہی یہ ہے کہ جام بدست بدست چلے ! یقیناً نہ آپ کا خون جوان ہے، نہ میرا، لیکن بقول غالب

آنکھوں میں تو دم ہے !

پھر یہ اور بات ہے کہ آپ اُن میں اشک پاتے ہوں، اور میں شرار !

تو از آتش دُخاں بینی، من آتش از دُخاں بینم !

---

(۵)

بندگی و بندہ پروری ——— قبلہ! :- آپ جانتے ہیں، میرے دل میں آپ کی کتنی عزت ہے، یعنی "خدائے غیر باطل" کے وجود یا عدم وجود پر تو میں گفتگو کر سکتا ہوں لیکن آپ کو "الٰہ باطل" باور کرنے میں کبھی میں نے تامل نہیں کیا، اگر اب بھی آپ کو میری بندگی و نیاز مندی کا یقین نہیں تو سوا اس کے کہ غالب کی طرح "نمرود کی خدائی" کا رونا روؤں اور کیا کر سکتا ہوں!

اس سے زیادہ بدنصیبی میری اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں دن کو دن کہوں تو آپ کے نزدیک غلط، دوسرے دن کو رات کہدیں تو صحیح! آخر ایسا کیوں ہے آپ ہی بتائیے، میری سمجھ میں تو آتا نہیں! کیا "بندگی" و "بندہ پروری" کی دُنیا میں ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے؟

(۶)

متاعِ کم ارز ——— مکرمی! - جو کچھ ارشاد فرمایا، بالکل درست! لیکن نتیجہ معلوم!

خرمنے دارم د ترسم بجوئے نستانی

آپ پر اعتماد نہ ہوگا تو کس پر ہوگا، لیکن اپنی "متاعِ کم ارز" پر اعتماد کیونکر پیدا کروں؟ وہ زمانہ جب صرف گنہگار "مستحق کرامت" سمجھے جاتے تھے، گزر چکا ہے؟ اب باندازۂ "استحقاق" "لطف و کرم" مفقود ہے!

پھر یہ کیا ضرور ہے کہ سب کچھ میری ہی زندگی میں ہو جائے۔ "ہمت دوشِ عزیزاں" کا بھی تو امتحان ہونا چاہیئے جب گدڑی اُتاروں گا تو اس کے لعل آپ ہی کی ملکیت ہوں گے، مطمئن رہیئے۔

(۷)

دعوائے عشق ——— جی ہاں، دیکھا، اور خوب دیکھا، اب آپ کیا پوچھتے ہیں، بس یوں سمجھئے:-

ز موجِ گل بہاراں بستہ زنار

میں بسا اوقات سوچتا ہوں کہ جب احساسِ حُسن روز بروز ضعیف ہوتا جاتا ہے تو حُسن کی پیداوار کیوں بڑھتی جاتی ہے پہلے صدیوں میں کوئی ایک لیلیٰ کوئی ایک شیریں، کوئی ایک دمن پیدا ہوتی تھی۔ اور اب یہ حال ہے کہ جدھر دیکھئے:-

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

لیکن ایمان و آگہی اور تمکین و ہوش کا سودا کرنے والا کوئی نہیں! غنیمت ہے کہ ایک آپ اِن "آوارگانِ غربت" پر رحم کرنے والے پیدا ہو گئے۔ ورنہ قیس و فرہاد کی نسل تو سمجھئے ختم ہی ہو چکی تھی۔

افسوس ہے کہ غریب قایم چل بسا ورنہ آپ کو دیکھتا تو وہ بھی شاید عشق ہی کرتا اور یہ کبھی نہ کہتا کہ:-

"اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہئیے!"

(۸)

نگہ اپنی اپنی ——— معنی نگاہا! - عطوفت نامہ، جسے "پیامِ جاں بخش" کہنا زیادہ موزوں ہے، کل پہونچا۔ تمام رات

سوچتا رہا کہ جواب سوا "شکریہ" کے اور کیا ہو سکتا ہے لیکن یہ چیز میرے احساس اور آپ کے لطف و کرم کو دیکھتے ہوئے بہت فروتر ہے۔

میری زندگی کی داستان اس قابل نہیں کہ آپ سنیں، اور اگر ہو بھی تو اس سے زیادہ میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا :-

رخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم دادند !

مجھے نہیں معلوم کہ صوفیہ کے یہاں طے منازل و کشفِ حجابات کی کیا صورت و ترتیب ہوتی ہے۔ لیکن یہاں تو "لاالٰہ" کے ساتھ ہی تمام پردے نگاہوں سے اٹھ گئے اور "الا اللہ" کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

لوگ حقیقت کی جستجو "ہاں" میں کرتے ہیں اور میں "نہیں" میں، وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو "نفی ماسوا" تک پہونچتے ہیں۔ اور یہاں ابتدا ہوتی ہے "نفی نفی" یا "ترکِ ترک" کی منزل سے۔

یقیناً یہ سب لغو و مہمل باتیں ہیں، اور سوا مزخرفات کے کچھ نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے طرہات "تقشف" کے جواب میں ان مہملاتِ "تصوف" سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔

آپ نے "زمانہ کی فرصت" کا ذکر کر کے میرے شوق میں اور زیادہ ہیجان پیدا کر دیا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ :-

عشق ہر جا می رود ما را بہ ساماں می برد

عمر کی ناپ سال و ماہ سے نہیں کی جاتی، بلکہ صرف ان چند ساعتوں سے جو "تری یاد میں گزر جائیں" اور اس لحاظ سے مجھے کبھی زمانہ کی طرف سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

دل جائے دگیر ست و نگہ جائے دگیر ست

کا گناہ مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوا، جو دیکھتا ہوں وہی سمجھتا ہوں۔ دوسروں کی آنکھیں خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں اگر ایک کو دو دیکھتی ہیں تو میرے کس کام کی!

(۹)

احساسِ خودی —— عتاب نامہ ملا ! - حالانکہ مجھے سب سے زیادہ پیار آپ کے غصہ ہی پر آتا ہے۔

میں یقیناً [illegible] سرزنش ہوں، اور دنیا میں سبھی "نیازمند" ایسے ہوتے ہیں لیکن "خداوندی" کی جو نئی راہیں آپ نے اختیار کی ہیں، وہ کس حد تک "لایق نیایش" ہیں، کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ؟

اب آپ جو چاہے کہئے ! لیکن اس سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا، کہ جن کی حمایت میں آپ نے مجھے موردِ عتاب بنایا ہے، اُن کے متعلق میرا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ :-

قطرۂ بودست و بجر بکیر انش کردہ ام !

پھر مجھے اُن کے دعوائے "انا البحر" پر تو اعتراض نہیں، لیکن وہ اس حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں کوئی "انا الشرق" کہنے والا بھی موجود ہے، میں دوسرے کے احسان کو برداشت کروں یا نہ کروں، لیکن خود جو کچھ کرتا ہوں وہ "خیالِ مزد" سے یقیناً بلند ہوتا ہے، یعنی باوجود سراپا نیاز ہونے کے صد درجہ بے نیاز اور باوجود "بندہ" ہونے کے سخت "خدا" واقع ہوا ہوں۔

(۱۰)

درسِ زندگی ۔۔۔۔۔ خط ملا! - کیا عرض کروں کہ پڑھ کر کتنا صدمہ ہوا - یقیناً حادثہ ناقابل برداشت ہے - لیکن برداشت کرنا ہی پڑے گا، دُنیا میں صرف انسان ہی کا وجود ایسا ہے جو غم میں بھی ہنس سکتا ہے!

آپ کو افسوس یہ ہے کہ یہ سب ناگہاں ہوا، حالانکہ تسکین کی اگر کوئی بات ہے تو صرف یہی ہے، اگر آنے والی مصیبت کی خبر پہلے سے ہو تو غم کی عمر بھی طویل ہو جائے - سینہ کو آہستہ آہستہ پتھر کا بنانا ہنسی کھیل نہیں - رہا سوال شکر و شکایت کا، سو فطرت کے مقابلہ میں یہ دونوں بے معنی چیزیں ہیں - پہاڑ نہ آپ کے سر ٹکرانے سے جنبش میں آسکتا ہے، نہ الحاح وزاری سے ۔۔۔ زندگی گزارنے کا بہتر طریقہ یہ نہیں کہ موت کو یاد کیا جائے یا مصائب پر ماتم! یہ دونوں باتیں ہستی کے منفی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں، حسینؑ کے نام پر کتنے عرصہ سے سینہ زنی کی رسم جاری ہے، لیکن اب تک حسینؑ کیا، کو ئی حُر بھی پیدا نہ ہو سکا - یاد رکھنے کی چیز حسینؑ کی زندگی تھی، نہ کہ موت! لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب خود ہم میں زندگی پائی جائے، لیکن ہم مُردہ ہیں اور موت ہی کا ذکر اچھا معلوم ہوتا ہے!

یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہو یا نہ ہو، موت کا خیال اپنی جگہ کوئی معنی نہیں رکھتا - اگر مرنے کے بعد بالکل معدوم ہو جاتا ہے تو فکر بے کار ہے - زندگی اگر نوم صغیر تھی تو اسے نوم طویل سمجھئے - پھر کیا رات کو سو جانے کے بعد کوئی احساس آیندہ یا گزشتہ کا باقی رہتا ہے؟ اور اگر مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے (جس کے تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں) تو پھر "فراق وجدائی" کے خیال سے گھبرانے کی وجہ؟

جائیے ہاتھ منہ دھوئیے اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر چار انگل وہسکی لیجئے، اور سینما چلے جائیے!

(۱۱)

احساسِ حقیقت ۔۔۔۔۔ کامیابیاں، اور خوش سامانیاں مُبارک! لیکن آپ نے غالب کا یہ شعر سُنا ہوگا:-

پیمانہ بہ راں رند حرام ست کہ غالب
در بیخودی اندازۂ گفتار نداند!

جوانی خود ایک نشہ ہے، چہ جائیکہ لذائذ تک دسترس! کہ اس صورت میں اگر کوئی بہک جائے تو قدرت کو بھی محاسبہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے!

فیروز کا خط آیا تھا، آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس میں کیا لکھا ہوگا، اب تو آپ کی عمر غالباً چالیس سال سے متجاوز ہو گی، اس لئے اس دل دُکھانے والی اداؤں میں قدرتاً کمی ہونا چاہئے - سایہ کا تعاقب پر لطف ضرور ہے، لیکن حقیقتوں کا احساس بھی کم دلچسپ نہیں، اگر آپ کے پاؤں میں کانٹے نہیں چُبھے، تو تھوڑی دیر ٹھہر کر ان کو بھی، دیکھئے جو راہ میں بیٹھ کر تلوؤں سے کانٹے نکال رہے ہیں ۔۔۔۔۔ ہمدردی نہ سہی، تماشہ سہی!

۱۲

گرانمایگی بے سروپائی ۔۔۔۔۔ محترم! - دل پُرسی اور ہمدردیوں کا شکریہ! لیکن

باغم چہ تاب دعوے و بر دل چہ اختیار

زمانہ میرے لئے کبھی نامساعد ثابت نہیں ہوا، اور اب بھی نہیں ہے! لیکن ایک وقت آتا ہے، جب انسان خود زمانہ کے لئے نامساعد ہو جاتا ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ جب تک "برگ وساز" کی فکر ہے، انسان زندہ ہے، لیکن اس فکر سے آزاد ہوتے ہی "گرانمایگی بے سروپائی" کا احساس شروع ہوتا ہے، جو پُرلطف بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ وہ اس لئے کہ ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا، اور یہ اس لئے، وہ کسی دوسرے کی مدد بھی نہیں کر سکتا!

یہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان باتوں کے سمجھنے والے ہیں۔ کسی اور سے کہوں تو وہ مذاق سمجھے گا، یا تصوف، سو مذاق کی حد تک تو خیر کوئی حرج نہیں، لیکن تصوف کا الزام واتہام کون اٹھائے۔

(۱۳)

دوستانہ تنبیہ ——— اے، خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ فطرتاً بہت رحم دل ہیں، ورنہ اس وقت تم خدا جانے کہاں ہوتے! یہ حماقت نہیں بدتمیزی تھی، اور بدتمیزی کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا، لیکن، خیر تم بچ گئے!

بنام علی بردۂ پناہ

ورنہ "ذوالفقارِ علی" تو خیر کیا، لیکن "تیشۂ فرہاد" ضرور تمہارے ہاتھ میں ہوتا اور اس وقت تم کہیں کوہ کنی کرتے ہوتے! اجی ——— تم سے یہ کس نے کہدیا کہ تم سے روٹھ کر ان کا جینا محال ہے۔ آپ ہیں ایسے "رشکِ یوسف" کیا کہنا ہے، کسی کے اخلاق کو فطری کمزوری سمجھ لینا، محبت کی دنیا میں اور زیادہ گناہ ہے، شریف انسان محبت کرنے والے کے سامنے اور زیادہ جھک جاتا ہے، لیکن تم ہو کہ اینٹھتے ہی جاتے ہو، سچ تو یہ ہے کہ تم بُرے، تمہاری فطرت بُری، لیکن قسمت اچھی پائی ہے، نبھتی چلی جا رہی ہے، ورنہ تم تو اس قابل تھے کہ تم کو قطب مینار کی چوٹی پر لے جا کر وہاں سے ڈھکیل دیا جاتا!

(۱۴)

حرفِ تلخ ——— تم بسا اوقات اتنا پریشان کر دیتے ہو کہ بے اختیار اپنا منہ پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے — ایک بار نہیں ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ تمہاری خواہش پوری کرنا میرے امکان سے باہر ہے، لیکن تم اسے بہانا سمجھتے ہو اگر تم شاعر بھی اچھے ہوتے، تو خیر ایک بات تھی، لیکن شاعری تمہارے یہاں نام ہے اُلجھے ہوئے بال، بڑھے ہوئے کثیف ناخن، گندے لباس، باچھوں تک پھیلی ہوئی پان کی سُرخی، منہ سے بیڑی کے بھبکوں، اور ایک ایک ہفتہ تک منہ نہ دھونے کا۔ ——— پھر تمہیں بتاؤ کہ جب خود مجھے تمہاری صورت وصحبت گوارا نہیں، تو ایک غیر شخص جس کو تم سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکر پسند کرے گا!

میں جانتا ہوں، تم سے دنیا میں کوئی کام نہ ہوگا، اس لئے شکر کرو جب تک بیکار جینے کی فرصت تمہیں حاصل ہے ورنہ جو کچھ نہ کر سکے اس کے لئے اب دنیا میں جگہ کہاں!

(۱۵)

فکرِ مآل ——— قبلۂ عالم! ۔ مکرمت نامہ پہونچا، لیکن ایسے بُرے وقت کہ میں آپ کے لطف وکرم سے مطلق

فایدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

آپ کے مشاغل میں جو لطیف تغیر پیدا ہوا ہے، وہ اگر خدا ساز بات ہے تو قابل رشک ہے اور اگر آپ کی سعی و جستجو کا نتیجہ ہے، تو باعث صد حیرت و استعجاب!

سچ ہے انسان نہ کبھی مرسکتا ہے، نہ بوڑھا ہو سکتا ہے، اگر وہ نہ چاہے، چلئے آپ تو غیر فانی ہو کر خضر و الیاس کی صف میں شامل ہو گئے، میرا کیا ہے۔ رہا رہا نہ رہا!

آپ کے دوست یہاں آئے، چند دن قیام بھی کیا، لیکن ختم خواجگان اور دلایل الخیرات نے انھیں فرصت ہی نہ دی کہ وہ مجھ سے مخاطب ہو سکتے، انسان کا اتنا نیک ہونا بھی کتنا بڑا عذاب ہے، سوچتا ہوں کہ اگر کبھی فرشتوں کا ساتھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ آپ کہیں گے کہ جہنم میں فرشتے کہاں۔ یہ بالکل سچ ہے، اور اسی لئے تو میں مرنے سے گھبراتا نہیں!

(۱۶)

طنز اعتراف — قبلۂ عالم و عالمیان! ۔ دُنیا آپ کی بزرگی کی قایل ہو یا نہ ہو، لیکن میں تو اسی وقت قایل ہو گیا تھا، جب سب سے پہلے آپ نے مجھے کافر کہکر، میرے ایمان کو غیر معمولی تقویت بخشی تھی۔

ہنوز در نظرم چشم نیم خوابے ہست

پھر اب اس کے اعادہ و تکرار سے کیا فایدہ۔ میں ایک ایسا بیمار ہوں، جس کا علاج ممکن نہیں، اور ہو بھی تو مجھے منظور نہیں۔ پھر جب مرض اور بدقسمتی دونوں مل جائیں، تو آپ یا کوئی اور کیا کر سکتا ہے اللہ بس باقی ہوس۔

(۱۷)

ماتم آزادی — نہ آپ کی عنایتوں کی کوئی حد، نہ میری نارسائیوں کی کوئی انتہا، لیکن نہ میں ان سے فایدہ اُٹھا سکتا ہوں، نہ آپ ان کا کوئی صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کا انتہائی خلوص ہے کہ میرے ہر درد دُکھ میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہیں، لیکن اگر میں اسے گوارا کر بھی لوں، تو کوئی دوسرا اس بار کو کیونکر اُٹھا سکے گا اور اس کا یقین کیونکر آئے گا کہ:۔

از خونِ دلم شیشۂ مے زہر بکام ست
بر حوصلۂ جامِ جم ایں بادہ حرام ست

انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب تدبیر و مصلحت، عقل و دانائی سب بیکار ہو جاتی ہے، ایک انسان جب سیلاب کا مقابلہ کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو پھر وہ ڈوب جانا ہی پسند کرتا ہے۔ غالب نے اس خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا ست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

آپ دیکھتے ہیں، آج کل کا ہنگامۂ دار و گیر۔ معاذ اللہ، کیا انسان سے زیادہ درندہ دُنیا میں کوئی اور پیدا ہوا ہے، اب تو اپنے آپ کو انسان کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ خیال تھا کہ ملک کی آزادی کے بعد یہاں مسرت و سکون کا ایک نیا دور شروع ہوگا، لیکن یہاں تو رہی سہی عافیت بھی ختم ہو گئی!

ز جوشِ گرمیِ بازارِ من دُکانم سوخت

(۱۸)

اب اور جب —— صدیقی —— میں جس غم کا شکار ہو کر سرد ہو چکا ہوں اس کے آپ ابھی صرف امیدوار ہیں، یوں آپ کی خاطر سے کہئے کہہ دوں کہ سبحان اللہ، کیا عزم واستقلال ہے، کیا صبر و شکر ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ حقیقی تلخیاں اس زندگی کی ابھی آپ کے پاس سے بھی ہو کر نہیں گزریں اور نہ اس کا اندیشہ۔

غالب کہتا ہے "غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا" یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب دہلی لٹنے کے بعد بھی دلوں میں حسن و عشق کی گرمیاں باقی تھیں اور شمع گل ہونے پر بھی لگن کی خاک میں کچھ چنگاریاں موجود تھیں، لیکن اب کہ آئینِ دلربائی کے ساتھ اندازِ جانگدازی و جانسپاری بھی بدل گیا ہے۔ صورتِ حال بالکل دوسری ہے یعنی یہ کہ اگر غمِ روزگار سے فرصت ہو تو خیر غمِ عشق ہی گوارا کر لیا جائے۔

اس وقت "اسد اللہ خاں" زمانہ کی شکایت کرتے تھے تو اس حسرت کا اظہار ہوا کرتا تھا کہ :۔

وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

مگر اس وقت تو سوال جرِ حیات اور نفسِ زندگی کا ہے۔ جوانی آئے تو اس کے جانے کا افسوس بھی ہو، ولولے پیدا ہوں تو ان کے فقدان پر ماتم بھی کیا جائے۔

سو مقصود کہنے کا یہ ہے کہ اگر آپ اس میں بھی مجھ سے دعوائے ہمسری رکھتے ہیں، یہ تو آپ کی ناانصافی ہے کیونکہ میرے آپ کے زمانہ میں پوری ایک صدی کا فرق ہے، میں انیسویں صدی کی چیز ہوں جب خشک سالیوں میں بھی لوگ تردامنی کی فکر سے غافل نہ رہتے تھے اور آپ بیسویں صدی کی پیداوار ہیں جب باوجود خوشحالی کے بھی عشق میں کسی کا بُرا حال دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس وقت لوگ صرف ذکرِ حسن سے بے چین ہو جاتے تھے اور اب پیکرِ جمال بھی سامنے سے دامن کشاں گزر جائے تو نبض کی رفتار ۹۰ سے ۹۵ نہیں ہوتی۔ آپ تو اب افسانوں میں اقتصادی و معاشی مسایل کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ آپ کو حاتم طائی اور چار درویش کی دلکشی کا حال کیا معلوم۔ "ایک بار دیکھا ہے اور پھر دیکھنے کی آرزو ہے"۔ ہائے وہ زمانہ اب کہاں، وہ خواب میں کسی صورت کا نظر آنا اور سنگلدیپ کے شہزادہ کا اس کی جستجو میں خاک بسر نکل جانا، دیکھا تو میں نے بھی نہیں تھا لیکن اُسے سُن کر لطف اتنا حاصل کرتا تھا گویا میں خود شہزادہ ہوں، آپ ان کو مزخرفات سمجھتے ہیں اور سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ یہ زمانہ علم و حکمت کا ہے، تحقیق و تفتیش کا ہے، کوئی حسین عورت سامنے سے گزر جاتی ہے تو آپ فلسفۂ جمالیات پر غور کرنے لگتے ہیں اور عشق کرنے سے پہلے اس کی سائکالوجی کا مطالعہ فرماتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں دُنیا اتنی عقلمند نہ تھی، حُسن زیادہ دلکش رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن جوانی ضرور زیادہ اندھی تھی —— "دیدن ہماں و جاں دادن ہماں"

الغرض مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ آپ نے جس درد و کرب کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت مجھے معلوم ہے اور میں آپ سے ہمدردی کرنے کے لئے طیار نہیں، کیونکہ جانتا ہوں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کو یہ سُن کر غصہ ضرور آئے گا لیکن اسی کے ساتھ یقین ہے کہ تکلیف میں کچھ کمی ہو جائے گی۔ آپ جواب میں اس سے انکار کریں گے لیکن آنکھ چار کر کے شاید کہنے کی جرأت نہ ہو!

افسوس ہے کہ میں فی الحال سفر سے معذور ہوں، ورنہ آپ کا نشہ دور کرنے کے لئے بہت سی ترشیاں اور بھی اپنے پاس رکھتا ہوں۔

فلاسفۂ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادئیین کا مذہب، نہایت عجیب اور مفید کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات حضرت نیاز کے اعتقادی مقالات کا مجموعہ، فہرست مضامین یہ ہے: ایران و ہندوستان کا آخر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ایڈیٹر، حقیقت نگاری۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مذہب حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز یعنی نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست، کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

فراست الید اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، بیماری، شہرت پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

مالہ وما علیہ حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا ثبوت انھوں نے دور حاضر کے بعض اکابر شعراء مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

نقاب اٹھ جانے کے بعد نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت اور علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ استفسارات تاریخی، علمی، ادبی معلومات کا ایک قیمتی مجموعہ۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

نقشہائے رنگارنگ غالب کی فارسی غزل گوئی اور اس کی خصوصیات پر نیاز فتحپوری کا ایک مقالہ قیمت ۱۲؍ (علاوہ محصول)

گلہائے جعفری جناب اثر لکھنوی کے سو منتخب اشعار مع مقدمہ از نیاز فتحپوری۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

دیگر مصنفین کی کتابیں

قول فیصل ۔ جناب اختر حیدرآبادی کی ایک طویل مرصع نظم جس میں وجود باری پر فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

فلسفۂ مذہب ۔ سید مقبول احمد کی مشہور مجتہدانہ تصنیف جس میں عقائد اسلام پر فاضلانہ بحث و تنقید کی گئی ہے قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

عورت و اسلام ۔ جناب مالک ایم اے کی مشہور تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کا درجہ کس قدر بلند کر دیا ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

مرثیہ نگاری و میر انیس ۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا بے لاگ تبصرہ انیس کے فن مرثیہ نگاری پر قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

ملک خطا کے شہزادے ۔ سید وصی احمد بلگرامی کا ایک شاہکار جس میں ایک خاص طنزیہ انداز سے شبلی وغیرہ کے بعض مذہبی نظریوں پر تنقید کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲؍ (علاوہ محصول)

مینیجر نگار لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶
REG. NO. 466

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء (مومن نمبر) مومن نمبر ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے سمجھنے کے لیے اس کا پڑھنا از حد ضروری ہے۔ قیمت پانچ روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۸ء (پاکستان نمبر) (پاکستان نمبر، نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء (افسانہ نمبر) نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اصول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۱ء (مشرق وسطیٰ نمبر) اس سالنامے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاست اور ان کی موجودہ اقتصادی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ریاض نمبر حضرت ریاض خیر آبادی کی شاعری اور ادبی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء (فرماں روایان اسلام نمبر) (فرمان روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء (علوم اسلامی نمبر) (علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) مع تتمہ جس میں اسلامی علوم و فنون پر تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر علمی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۶ء (خدا نمبر) خدا کا تصور عہد تاریک تک، مبتنی تاریخ بتبصرہ مذاہب عالم پر۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۷ء (اصناف سخن نمبر) غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ مرثیہ وغیرہ جملہ اصناف سخن پر ایک بیش بہا ذخیرہ معلومات۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۸ء (معلومات نمبر) یہ سالنامہ مجموعہ ہے بہت سی ایسی تاریخی علمی ادبی اور مذہبی معلومات کا جن کا علم ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ گویا یہ ایک نوع کی سائیکلوپیڈیا ہے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۹ء (تنقیح اسلام نمبر) (اسلام و تعلیمات اسلام کا صحیح مطالعہ روایتی اصول سے ہٹ کر خالص عقلی و اخلاقی نقطۂ نظر سے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ